(ڈرامے)
بزمِ داغ
ابن کنول

ڈرامے

بزمِ داغ

ابن کنول

نام کتاب : بزمِ داغ (ڈرامے)

مصنف : ابن کنول

سن اشاعت : ۲۰۲۰

ناشر : مصنف

قیمت : ایک سو پچاس روپے

BAZM-E-DAAGH

by

Ibne Kanwal

Department of Urdu

University of Delhi, Delhi-110007

Email: ibnekanwal@yahoo.com

www.ibnekanwal.com

Distributor:

Kitabi Duniya

1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,

Opp. Anglo Arabic School, Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)

Mob: 9313972589, Ph: 011-23288452

E-mail: kitabiduniya@gmail.com

انتساب

محترم ساغر علی

اور

محترمہ صالحہ خاتون

کے نام

کہ جن کی سرپرستی والدین کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتی

ترتیب

ڈاکٹر محمد کاظم
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

تقریظ

اردو میں ڈرامے کے سفر میں شخصی ڈرامے کا ایک اہم باب ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی خاص موقع پر ہی شخصیت کو مرکز میں رکھ کر ڈرامے لکھے گئے بلکہ ابتدائی زمانے سے ہی مختلف دور میں مختلف مذہبی، تاریخی اور سماجی شخصیات پر ڈرامے ملتے ہیں۔ ان میں سے کئی اہم شخصیات کو مرکز میں رکھ کر لکھے گئے ڈرامے نہ صرف اردو بلکہ ہندوستانی ڈرامے کے شاہکار میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرے بعد (غالب)، آگرہ بازار (نظیر اکبر آبادی)، تغلق، اورنگ زیب، علامہ اقبال، کے ایل سہگل، سارا شگفتہ، جیوتیبا پھولے، ربندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذرل اسلام، ایک عورت ہیپشیا تھی، گاندھی اور امبیڈکر، مولانا آزاد، عزیزن، دارا

شکوہ، سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر، بابر کی اولاد وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام ڈراموں کی خاصیت یہ ہے کہ انھیں کامیابی کے ساتھ اسٹیج پر پیش کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے بعض تو کلاسک کا درجہ رکھتے ہیں اور آج بھی نہ صرف کامیابی سے کھیلے جا رہے ہیں بلکہ ان سے تحریک حاصل کر کے اس نہج کے ڈرامے لکھنے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان میں کچھ لوگ کامیاب ہیں تو کچھ کا مشق سخن جاری ہے۔

موجودہ دور میں اردو شاعر وادیب کے فکر وفن کو مرکز میں رکھ کر کئی ڈرامے لکھے گئے جنھیں کامیابی سے اسٹیج پر کھیلا بھی گیا ان میں سے ایک ڈراما 'بزم داغ' ہے۔ ڈراما بزم داغ اردو کے اہم افسانہ نگار ابن کنول کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ستمبر 2016 میں شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے داغ دہلوی پر ایک نیشنل سمینار کا انعقاد کیا تھا۔ اس سمینار کے مندوبین میں اردو کے اہم قلم کاروں کے ساتھ پروفیسر ابن کنول اور مجھے بھی شرکت کی دعوت ملی تھی اور ہم اپنے مقالے کے ساتھ شریک سمینار بھی ہوئے تھے۔ اس سمینار کے لیے مقالہ تحریر کرنے کی غرض سے کم وبیش تمام لوگوں نے داغ دہلوی کی زندگی اور ان کی شاعری سے متعلق مواد کا مطالعہ ضرور کیا ہوگا اور سب نے اپنی دلچسپی اور موضوع کی مناسبت سے داغ کے متعلق نظریہ بھی قائم کیا۔ اسی طرح پروفیسر ابن کنول نے بھی نتیجہ نکالا اور اپنے خیالات کو ایک عدد مقالے میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر ایک افسانہ بھی تحریر کیا۔ اس مقالے اور افسانے کو سمینار

کے اجلاس اور شام افسانہ میں پیش کیا گیا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ان کے مقالے اور افسانے پر نہ صرف بحث ہوئی تھی بلکہ بہت لوگ داد دے رہے تھے تو کچھ اعتراض کے ساتھ ساتھ ناراضگی کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ وجہ ظاہر ہے کہ بت شکنی کو پہلے اچھا نہیں سمجھا جاتا بعد میں اسے سراہا جاتا ہے۔ سمینار ختم ہوا اور سب اپنے اپنے جائے قیام کو لوٹے۔ دن مہینے گزرتے گئے اور پھر ایک دن ابن کنول صاحب نے ایک پرنٹ آؤٹ میرے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے بہت ڈرامے بازی کرلی اب اس تحریر کو پڑھیے۔ دیکھا تو داغ دہلوی پر ایک اسٹیج ڈراما مکمل صورت میں موجود ہے۔ اس کے چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اس ڈرامے کو کلکتہ کے ادبی جریدے 'فکر و تحریر' میں ڈاکٹر نعیم انیس نے شائع کر دیا ہے۔ ابھی اس ڈرامے کے مطالعے کے بعد غور و فکر کر بھی نہیں پایا تھا کہ یہ اعلان آیا کہ دہلی اردو اکیڈمی کے ڈراما فیسٹیول میں اسے ایم سعید عالم کی ہدایت میں پیش کیا جانا ہے۔ اور پھر اسے اس ڈراما فیسٹیول کے افتتاحی ڈرامے کے طور پر اسٹیج پر دیکھنے کا موقع ملا۔ اس دوران گفتگو سے معلوم ہوا کہ ابن کنول صاحب کا یہ پہلا ڈراما نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی انھوں نے کئی ڈرامے لکھے ہیں اور ٹیلی ویژن کے لیے بہت سے ڈرامے اور سیریلس تحریر کیے ہیں۔

اب ابن کنول صاحب کے چار ڈرامے بشمول بزم داغ میرے سامنے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل پہلا ڈراما 'بزم داغ' ہے۔ اس ڈرامے کی

خوبی یہ ہے کہ اسے داغ کی زبانی ہی پیش کیا گیا ہے یعنی اس کا راوی بھی داغ ہے اور مرکزی کردار بھی۔ چونکہ ابن کنول صاحب ایک افسانہ نگار ہیں اس لیے پلاٹ کا تانا بانا بننے کا فن تو جانتے ہی ہیں۔ انھوں نے فلیش بیک کی تکنیک سے کام لیتے ہوئے داغ کی آخری عمر سے شروع کرتے ہوئے ان کی زندگی کے خاتمے پر اپنے ڈرامے کو ختم کیا ہے۔ درمیان میں بچپن، نوجوانی اور جوانی کے زمانے کے داغ مختلف اوقات میں اسٹیج پر بذات خود تشریف لاتے ہیں اور نہ صرف اپنی زندگی بلکہ اپنے دور اور اس وقت کے ہندوستان کی ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ داغ کا زمانہ ہندوستان میں مغل حکومت کا خاتمہ اور برٹش راج کے عروج کا ہے۔ مغل حکومت لال قلعے میں محسور تھی اور بادشاہ وظیفہ خوار تھا۔ ایسے میں داغ کے بچپن اور نوجوانی کے دن کیسے گزرے اور ان کی ذاتی زندگی اور حالات کیا تھے اسے ڈراما نگار نے جس انداز میں پیش کیا ہے آپ بھی دیکھیں:

مرزا خاں: ہاں میاں! دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ حسن علی صاحب اپنے اندر کی تاریکی کو دور کرنے کے لیے خارجی قمقموں سے دل بہلانا پڑتا ہے۔ قدرت نے تو میرے اندر کی تاریکی کو میرے چہرے ہی پر نمایاں کردیا ہے۔ میری روسیاہی تو جگ ظاہر ہے۔ خوبصورت ماں کا

بدصورت بیٹا- اوپر والے نے بھی کیا خوب مذاق
کیا ہے۔شاید ماں کے گناہوں کی سیاہی میرے
چہرے پر نمایاں کردی ہے۔

ڈراما نگار نے خود داغؔ کی زبان سے ان کے خاندان اور ان کی دلی تکلیف کا اظہار کروایا ہے۔ داغؔ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے بچپن کے دن قلعہ معلی میں گزارے اور وہیں شہزادے کی صحبت میں سپہ گری کے ساتھ ساتھ شاعری کا درس لیا۔ داغؔ کے والد کا قلعہ سے تعلق نہ تھا اور نہ ہی وہ مرزا فخرو کی اولاد تھے۔ ہاں فخرو ان کے والد ضرور بن گئے تھے۔ ان نکات کو مدنظر رکھ کر ابن کنول صاحب کا ماننا ہے کہ داغ قلعے میں رہ ضرور رہے تھے لیکن ضروری نہیں کہ انھیں وہ تمام سہولیات میسر ہوں جو فخرو کی اولاد کو حاصل تھی۔ داغ کو مرزا فخرو اور ان کے اولاد کی صحبت ضرور ملی لیکن ان کے اندر کا کرب انھیں مسلسل ضرب دیتا رہا کہ وہ نہ تو قلعے کی اولاد ہے اور نہ ہی اس پر یا مرزا فخرو کی جائداد پر اس کا کوئی حق ہے۔ ان کے اس درد کو ڈراما نگار ابن کنول کے الفاظ میں آپ بھی دیکھیں:

مرزا خاں: نواب صاحب! میں نے بہت مجبور زندگی گزاری
ہے۔ میں ہر جگہ ماں کے ساتھ جانے کے لیے
مجبور تھا۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ قلعۂ معلی میں میں

نے شاہی زندگی گزاری۔ بادشاہت تھی ہی کہاں؟
بادشاہ کے پاس ہی دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔
ان کا ولی عہد کیا دیتا۔صرف خطابات۔لوگ خوش
ہوتے تھے۔ بادشاہ نے خطاب سے نوازا۔ میری
ماں کو شوکت محل کا خطاب ملا۔صرف شوکت محل۔
نہ محل تھا، نہ شوکت ۔وظیفہ خوار بوڑھا بادشاہ۔
نااہل اور عیاش شاہزادے۔ ہر طرف سازشیں۔
جانتے ہیں حسن علی صاحب! میری زندگی کو برباد
کرنے میں قلعہ معلی کا قیام ہے۔ وہاں کے
ماحول نے مجھے بگاڑ دیا۔ ہر طرف رقص وسرود،
طاؤس ورباب اور کوئی شغل نہیں تھا۔

یہی نہیں بلکہ داغ دہلوی کی ماں اور خالہ دونوں کم وبیش ایک ہی قبیل کی تھیں۔ ماں دہلی میں تھیں تو خالہ رام پور میں اور دہلی کے بعد داغ کی ماں نے بھی اپنی بہن کی مانند رام پور کا رخ کیا۔ جب ماں رام پور منتقل ہوئی تو نوجوان داغ کو بھی ساتھ لے گئی۔ نواب رام پور نے انھیں اسطبل کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپیں۔ اور پھر داغؔ نے اپنی حقیقی زندگی کو اپناتے ہوئے ان کے سفر میں پیش آنے والے مشاہدات اور تجربات کو پیش کیا۔ انگریزی حکومت کی مضبوط ہوتی بنیاد اور ہندوستانی حکومت کی تنگ ہوتی زمین کو بھی داغ نے محسوس کیا۔ اپنی جوانی

اور شادی کے واقعات کا اظہار فیض اور غالب کے انداز میں کیا ہے۔ اس حوالے سے ابن کنول صاحب نے بہ زبان داغؔ کیا کچھ کہا ہے آپ بھی دیکھیں:

مرزا خاں: جی ہاں! قدر اس وقت بھی تھی۔ بس زندگی داغدار تھی۔ نواب صاحب! قلعہ کی زندگی نے ہمیں لہو و لعب، رقص و سرود کا عادی بنا دیا۔ ہماری ماں نے پندرہ سال ہی کی عمر میں ہماری شادی بھی کردی۔ اپنی بہن کی اس بیٹی سے جو والیٔ رامپور نواب یوسف علی خاں کی بیٹی تھی۔ نواب شمس الدین خاں کا بیٹا، نواب یوسف علی خاں کی بیٹی، لیکن قسمت میں کاسۂ گدائی۔ اس لیے کہ وراثت کے دونوں جائز مستحق نہیں تھے۔

ان مکالموں سے ایک جانب داغ کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف اس زمانے کے حکمراں، ان کے رویے اور ان کی حالت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب انگریز اپنی حکومت قائم کر چکے تھے ہاں اعلان کا انتظار تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے بادشاہ اور نوابین کی حکومت ان کے محل میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ کئی انگریزوں کے ماتحت تھے تو کئی ان کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کئی خوف زدہ تھے تو کئی پنشن دار۔ اور چوں کہ حکومتیں ان

کے محلوں میں سمٹ کر رہ گئی تھی اس لیے اب بادشاہ اور نوابین کے چاہنے والے اور خدمت گار بھی ان کے ساتھ ہی رہنے لگے تھے۔ اور بادشاہ، نواب یا شاہزادے جسے چاہتے تھے انھیں محل کے حدود میں ہی بلا کر رکھ لیا کرتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں نواب مرزا خاں داغؔ کی ماں بھی شامل تھی۔ اس ڈرامے میں داغؔ خود کہتے ہیں:

مرزا خاں: (طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے) نواب صاحب! حویلی میں پیدا ہو کر کوئی نواب نہیں ہو جاتا۔ قلعہ کا ہر رہنے والا شاہزادہ نہیں ہوتا۔ میرا نام ابراہیم رکھا گیا لیکن میں نے اسے تبدیل کرلیا۔ جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ میں نہ کہیں کا نواب تھا، نہ امیر، نہ وزیر، نہ کوئی جاگیردار۔ ایک نواب کی ناجائز اولاد۔ میں نے اپنا نام ہی نواب مرزا خاں رکھ لیا۔ میں خود ساختہ نواب ہوں، ذلتوں سے بچنے کے لیے۔ اپنے ہم عمروں کے فقروں سے تنگ آ کر۔ کہتے تھے تم اس سماج پر بدنما داغ ہو۔ میں نے تخلص ہی داغؔ رکھ لیا۔ واقعی میں سماج پر بدنما داغ ہوں۔ (کچھ وقفہ کے بعد) نواب حسن علی خاں صاحب! میں نے انتقاماً وہ راستہ اختیار

کیا جو میری ماں نے کیا تھا۔ میری ماں نے نہ
جانے کتنے مردوں سے رشتے قائم کیے۔ میں نے
عورتوں سے رشتے قائم کر کے انتقام لیا۔

داغؔ اور ان کی والدہ کی زندگی کی عکاسی ان مکالموں سے بخوبی ہوتی ہے۔ داغؔ ایک اہم شاعر ہیں۔ داغؔ دہلوی کہلاتے ہیں لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ دلی سے باہر گزرا یہاں تک کہ آخری عمر حیدرآباد میں گزری۔ غالب کی مانند کلکتے کا سفر کیا لیکن دونوں کے مقاصد مختلف تھے۔ ایک کا مقصد پنشن جاری کروانا تھا تو دوسرا کلکتے کی جادوگرنی اختری بیگم سے عشق کرنے کے بعد دل سے مجبور ہو کر کلکتے گیے۔ اور اس مجبوری نے زندگی بھر ان کا ساتھ نبھایا۔ وہ جہاں بھی رہے دل کے ہاتھوں مجبور رہے۔ ان کی زندگی جس نشیب و فراز سے گزری اس کا قلق انھیں ہمیشہ رہا۔ ان محرومیوں اور ناکامیوں کا درد ان کے دل میں ہمیشہ ہوا رہا۔ اور بقول شاعر 'غازہ ہے آئینہ دل کے لیے گردِ ملال' یا پھر 'موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں' کے مصداق داغؔ کو بھی اس سے نجات نہیں ملی۔ حالاں کہ اس سے نجات پانے کے لیے نوابین کی صحبت حاصل کی اور یکے بعد دیگرے کئی عشق کیے، لیکن ہمیشہ ناکامی اور مایوسی ہی کا سہارا ملا۔ ابن کنول صاحب نے ان کی شاعری اور زندگی کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد مرزا خاں اور نواب حسن علی کی گفتگو کے ذریعے اس جانب جن الفاظ میں روشنی ڈالی ہے آپ بھی دیکھیں:

مرزا خاں: جی! صحیح فرماتے ہیں۔ میں نے زندگی بھر اپنی محرومیوں سے انتقام لیا۔ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک نواب کی ناجائز اولاد۔ وراثت کا حقدار نہیں۔ کتنے باپ ملے۔ لیکن کسی کا وارث نہیں۔ زندگی میں جو تاریکی تھی، پروردگار نے وہ سیاہی چہرے پر بھی انڈیل دی۔ نواب صاحب کوئی غیرت مند آدمی ہوتا تو کہیں سے کود کر اپنی جان دے دیتا۔ لیکن میں نے ہار نہیں مانی۔ اپنا مقام خود پیدا کیا۔

حسن علی: بے شک! آج پورے ہندوستان میں آپ کے اور آپ کی شاعری کے قدرداں موجود ہیں۔

مرزا خاں: جی ہاں! اب کسی کو یاد نہیں، میں کون ہوں؟ کس خاندان سے ہوں؟ لیکن آج یہ بندۂ کمینہ جہان استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، بلبلِ ہندوستان، نواب فصیح الملک مرزا خاں داغؔ کہلاتا ہے۔ (طنزیہ قہقہہ لگاتے ہوئے) نواب صاحب خود کو فراموش کرنے کے لیے میں نے شاعری اور حسن کا سہارا لیا۔ شاعری نے میری داغدار زندگی کو

بے داغ کردیا اور حسیناؤں کی صحبت نے میرے
احساس محرومی کو ختم کیا۔ کبھی منّی بائی، کبھی زہرا
بائی، کبھی کبرا بیگم، کبھی صاحب جان، کبھی اختر
جان، کبھی لطیف جان، کس کس کے نام لوں۔

اس ڈرامے کے مطالعے کے بعد داغ کی زندگی اور شاعری کے کئی اہم گوشوں کا علم ہوتا ہے۔ ان پر گفتگو کو سمیٹتے ہوئے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ داغ کی زندگی پر اور بھی ڈرامے لکھے گئے لیکن ان ڈراموں میں اتنے گوشے سامنے نہیں آتے ہیں جتنا اس ڈرامے میں سامنے آئے۔ شاید ان ڈراموں کو اس پیانے پر اسٹیج ہونے کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا اور ہم جانتے ہیں کہ ڈراما اسٹیج ہونے کے بعد مکمل ہوتا ہے، یہی صورت حال اس ڈرامے کے ساتھ بھی ہے۔ یعنی اس کے مطالعے کے دوران وہ گوشے نمایاں نظر نہیں آتے جو اسے اسٹیج پر دیکھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس ڈرامے کی خوبی یہ ہے کہ اسے ہندوستان کا بڑا اسٹیج ملا اور اب یہ ایم سعید عالم کی ہدایت میں ہندوستان گیر سطح پر مسلسل اسٹیج کیا جارہا ہے۔

اس مجموعے کا دوسرا ڈراما 'ایک بادشاہ کی کہانی' ہے۔ حالاں کہ یہ ڈراما بیسویں صدی کے آخر میں لکھا گیا لیکن اس کی معنویت آج زیادہ نظر آتی ہے۔ ہم سب واقف ہیں کہ آج بادشاہت کا اصل مطلب ہندوستان کی عوام کی سمجھ میں آرہا ہے۔ اس ڈرامے کا پس منظر تو ایران ہے اور اس کا پلاٹ ایران کے

بادشاہ محمد رضاشاہ پہلوی کی زندگی اور ان کی حکومت کے ارد گرد تیار کیا گیا ہے۔لیکن یہ حاکم، یہ جگہ اور ملک کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اور اس پر حکومت کرنے والے بہت سے بادشاہ کا عکس دیکھتے ہوئے ہم آج کے دور کا منظر بھی اس ڈرامے میں دیکھ سکتے ہیں۔ابن کنول صاحب نے تاریخ کے دریچے کو وا کرتے ہوئے بڑے خوبصورت انداز میں بادشاہ کی ملکہ سے اپنی بات کہلوائی ہے۔آپ بھی دیکھیں:

ملکہ: اتنے مایوس نہ ہوئیے۔تاریخ گواہ ہے کہ اب سے پہلے ان گنت بادشاہوں کے سروں سے تاج چھینے جاچکے ہیں۔ کیا ہندوستان جیسے وسیع ملک پر حکومت کرنے والے مغلوں کے آخری شہنشاہ کی حالت ہم سے بہتر تھی؟ انھیں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ تمام آرائشیں چھین لی گئی تھیں۔ہم تو آزاد ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ صنف ڈراما میں ڈراما نگار کو اپنی بات کہنے کے لیے کسی کردار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ کردار مختلف اوقات میں مختلف بھی ہوسکتا ہے اور پورے ڈرامے میں ایک ہی کردار بھی ہوسکتا ہے۔ چوں کہ ابن کنول ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں اس لیے انھیں معلوم ہے کہ کب کس بات پر سے کتنا پردہ اٹھانا چاہیے اور کس کے ذریعے کون سی بات کرنی چاہیے۔اس ڈرامے میں ابن کنول صاحب نے اپنی بات ایک سے زائد کرداروں کے ذریعے بیان کی ہے۔

مثال کے طور پر اس منظر کو دیکھیں:

شہنشاہ: ہم اپنے ملک سے دور ہوگئے۔کیا وہاں ہم پھر جاسکیں گے۔ ہمارا قصور کیا تھا۔ کیوں ہمارے خلاف بغاوت ہوئی، ہم تو ملک کی ترقی چاہتے ہیں۔ہم نے ایسا کیا گناہ کیا جس کی سزا ہمیں مل رہی ہے۔

ایک عورت: (گونجتی ہوئی آواز) تو نے میرے چار بیٹوں کو موت کی نیند سلادیا، تو نے میری کوکھ سونی کردی۔

دوسری عورت: تو نے مجھے یتیم کردیا۔

تیسری عورت: تو نے میرے سہاگ کو لوٹ لیا۔

تینوں کی ملی جلی آواز: تو قاتل ہے۔تو قاتل ہے۔تو قاتل ہے۔

شہنشاہ: (چیختے ہوئے) نہیں! نہیں! ہم نے کسی کا قتل نہیں کیا۔ ہم نے کسی کی کوکھ سونی نہیں کی۔ہم نے کسی کو یتیم نہیں کیا۔ہم نے کسی کا سہاگ نہیں لوٹا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔

ان مکالموں سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ڈراما نگار کیا کہنا چاہتا ہے اور آج کے دور میں ان مکالموں سے کیا معنی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ہم جس دور

سے گزر رہے ہیں وہ ایسا ہی دور ہے جب ظلم بھی احسان جتا کر کیا جا رہا ہے۔ 'وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا'۔

اس ڈرامے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک سے زیادہ مسائل کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں سماجی اور سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ عام انسان کی زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے مسائل اور ایک بادشاہ کی زندگی کے ذاتی مسائل کو ایک ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ ہر شادی شدہ جوڑا اولاد کا سکھ حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہر والدین اپنی اولاد کو نہ صرف ترقی کرتا ہوا بلکہ حکمراں طبقہ اپنی اولاد کو حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت پیدا کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد سے گزر جانے میں عار محسوس نہیں کرتا اور اپنا مقصد نہ پانے کی صورت میں بعض اوقات خود کو ختم کر لیتا ہے یا عوام نجات حاصل کرنے کے لیے اسے ختم کر دیتی ہے۔ اس سے ہم سب بھی واقف ہیں کیوں کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں بلکہ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔

اس ڈرامے میں بھی بادشاہ اولاد کا خواہش مند ہوتا ہے اور یہ سکھ نہ پانے یا نہ دینے کی صورت میں اس کی پہلی ملکہ فوزیہ بادشاہ کے نام ایک خط لکھ کر چلی جاتی ہے اور بادشاہ کو دوسری شادی کرنے کی اجازت کے ساتھ ساتھ گزارش بھی کر جاتی ہے۔ بادشاہ اس پر عمل کرتا ہے لیکن دوسری ملکہ ثریا کو بھی بادشاہ کی خواہش پوری کرنے میں ناکامی ملتی ہے اور نتیجتاً وہ بھی بادشاہ کو چھوڑ کر چلی جاتی

ہے۔ آخر کار تیسری ملکہ سے ایک اولاد ہوتی ہے جو ولی عہد قرار پاتا ہے لیکن اسے حکومت کرنے کا سکھ نہیں مل پاتا اس لیے کہ خود بادشاہ ہی بادشاہت سے معزول کر دیا جاتا ہے۔ اور اب اس پر مصیبت نازل ہونا شروع ہوتی ہے۔ ملک چھوڑنا پڑتا ہے، اس پر جان لیوا حملہ ہوتا ہے۔ اس وقت ان کی اولاد کا سکھ نہ دینے والی ثریا اپنی جان دے کر بادشاہ کی جان بچاتی ہے اور جب بادشاہ کو اس کا علم ہوتا ہے تو وہ خود کو گولی مار کر اپنی جان دے دیتا ہے۔ بیسویں صدی میں لکھے گئے اس ڈرامے میں آج کی فکر صاف نظر آتی ہے۔ عورت کا استحصال ہر سطح پر ہے۔ ہر طبقہ میں اسے اپنے خاندانی سلسلہ کو آگے بڑھانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور ایسا نہ ہونے پر ایک غیر ضروری شئے سمجھ کر اسے اپنی زندگی سے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس ڈرامے میں عورت کی لاچارگی اور بے بسی ہی مرکزی خیال ہے جب کہ عورت مرد کے لیے اپنی جان کی بھی قربانی دے دیتی ہے۔ ڈراما 'بزم داغ' کی طرح اس میں بھی فلیش بیک کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔ مکالمہ سیدھا اور اکہرا ہے۔ کردار کا ارتقاء قدرِ ست ہے اور اس کی زبان کی وجہ سے کردار ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں۔

اس مجموعے کا تیسرا ڈراما 'خواب' موجودہ دور کے مسائل پر مبنی ڈراما ہے۔ یہ ڈراما بیچ بیچ میں خواب میں جاتا ہے۔ ایک انجانا خوف بار بار ذہن میں آتا ہے جو بعد میں خواب کے ذریعے اپنی پرتیں کھولتا ہے۔ خواہ وہ عورتوں کی حفاظت کا مسئلہ ہو یا اس کی عصمت کا۔ سماج کے مختف لوگ مختلف طریقے سے ان

کا استحصال کرتے ہیں۔آئے دن خواتین کے ساتھ ہونے والے مختلف واقعات کی جانب مختلف زاویے سے پروفیسر ابن کنول نے روشنی ڈالی ہے۔ اس ڈرامے کے ایک منظر کا چھوٹا سا حصہ دیکھیں:

نجمہ: مجھے میرے گھر پہنچا دیجئے۔ میں بہت پریشان ہوں۔
بالکل تنہا ہوں۔

(سپاہی ہنسنے لگتے ہیں)

ایک سپاہی: ارے آدمی تو جہاں چاہے اس کا گھر بن سکتا ہے۔
ہم تمہارا گھر بساتے ہیں۔

دوسرا سپاہی: ہم تمہاری پریشانی دور کرتے ہیں۔

تیسرا سپاہی: اور ہم تمہاری تنہائی دور کرتے ہیں۔

(سپاہیوں کے زور سے قہقہہ لگانے کی آواز — نجمہ کی منت)

نجمہ: نہیں......نہیں......مجھے چھوڑ دیجئے......مجھے چھوڑ دیجئے۔

(یہ آوازیں دب جاتی ہیں اور پھر نور محل کی آواز ابھرتی ہے)

اس سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جن کے ہاتھوں میں حفاظت کی ذمہ داری ہے انھیں سے ہم محفوظ نہیں ہیں۔ یہاں سپاہی کو صرف سپاہی کے طور پر نہیں بلکہ محافظ کے طور پر دیکھنا چاہیے۔وہ محافظ ہمارا نمائندہ بھی ہو سکتا ہے اور انتظامی امور کا ذمہ دار بھی۔ آج ملک میں ایسی ہی صورت حال ہے۔ بلکہ اب تو انسان کب درندے میں تبدیل ہو جائے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ

رشتوں کا پاس بھی نہیں رہا۔ ایسے ماحول میں یہ ڈراما ہمارے سماج کی مختلف پرتوں کو سامنے لانے میں مدد کرتا ہے۔

اس مجموعے کا آخری ڈراما 'پہلے آپ' ہے۔ اس ڈرامے میں بھی انسانی ہوس اور خودغرضی کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تین کرداروں پر مبنی کشمکش اور تذبذب سے پر ایک دلچسپ ڈراما ہے۔ کلیم اور امینہ شوہر بیوی ہیں۔ کلیم اسکول ماسٹر ہے۔ شوہر بیوی میں بہت محبت ہے اور سلیم کے کہنے پر کہ آپ لوگوں میں کبھی جھگڑا یا نااتفاقی ہوئی ہے؟ دونوں جواب دیتے ہیں کہ ایسا اب تک نہیں ہوا ہے اور اگر کوئی چاہے بھی تو ہم میں نااتفاقی پیدا نہیں کرسکتا۔ ایک دن سلیم موت کا فرشتہ بن کر ان میں سے ایک کو لے جانے کی اداکاری کرتا ہے۔ دونوں مرنے سے انکار کرتے ہیں۔ سلیم کہتا ہے کہ میں آیا ہوں تو ایک کو تو لے کر ہی جاؤں گا اب فیصلہ تم دونوں کے ہاتھ ہے۔ اور یہ فیصلہ کرنے کے لیے ان دونوں کو تھوڑا وقت دیا جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان نوک جھونک، زندگی میں مزید کچھ کرنے کی خواہش، اپنے اپنے طریقے سے زندگی جینے کی للک، ایک دوسرے پر الزام تراشی، دونوں کے درمیان جھگڑے، یہاں تک کہ شوہر بیوی ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے ہوجاتے ہیں۔ دونوں کے اپنے اپنے جواز ہیں زندہ رہنے کے۔ اس موقع پر کلیم اور امینہ موت کے فرشتے یعنی سلیم کو زندہ رہنے کا جواز دیتے ہوئے کہتے ہیں:

کلیم: مجھے تو اسکول میں بہت کام ہیں..... بچوں کے امتحان
ہونے والے ہیں...... میری ترقی ہونے والی ہے
...... اگلے مہینے میرا ہیڈ ماسٹر بننے کا چانس ہے۔
ایسا کرو اسے لے جاؤ، اسے کوئی کام نہیں ہے۔

امینہ: واہ جی! مجھے کیوں کام نہیں ہوتا..... میں کیسے
جاسکتی ہوں..... میرے بھائی کی شادی ہے۔
مجھے سنار سے اپنا ہار اور چوڑیاں لینے ہیں.....
میں تو اسے روپے بھی دے چکی ہوں۔

اور آخر میں سلیم اس راز پر سے پردہ اٹھاتا ہے کہ کوئی موت کا فرشتہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود دونوں کے اندر ندامت یا شرمندگی کا ذرہ برابر احساس نہیں ہوتا۔ یہ ڈراما انسان کی خودغرضی اور اس خودغرضی میں صرف اور صرف اپنا فائدہ دیکھنے والوں کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے۔موجودہ دور میں اکثر تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنا فائدہ ہو یا نہ ہو سامنے والے کا نقصان ضرور ہو، کے جذبے کے ساتھ زندگی گزارنا شامل ہوتا ہے۔موجودہ دور کی نفسیات کی عکاسی کرنے والا ایک اہم ڈراما ہے۔

ان چاروں ڈراموں میں چار مختلف پلاٹ کو زمانے کی ناہمواریوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان ڈراموں میں انیسویں، بیسویں اور اکیسویں صدی کی تہذیب و ثقافت، انسان کی فکر اور اس کے رویے، اخلاق و اطوار کے گرتے

معیار اور خود پرستی کے بڑھتے رجحان کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان ڈراموں میں فلیش بیک کی تکنیک دکھائی دیتی ہے تو پیش کش میں سادگی کا احساس ہوتا ہے۔ چوں کہ پروفیسر ابن کنول ایک افسانہ نگار ہیں اس لیے ان ڈراموں میں بھی افسانوی رنگ صاف دکھائی دیتا ہے۔ ایسا ہونا ڈرامے کے لیے عیب نہیں ہے لیکن اگر کردار اپنی اصلی صورت میں نہ رہ کر اس رو میں بہنے لگے تو عیب ضرور ہے۔ ڈرامے کے پلاٹ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ کردار بھی ارتقائی منزل طے کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر ڈراما اسٹیج نہ کیا جاسکے یا اس میں اسٹیج پر پیش کیے جانے کی گنجائش نہ ہو تو اسے مکمل ڈراما نہیں کہا جاسکتا۔ ابن کنول کنول صاحب خود اداکار اور اسٹیج فنکار ہیں اس لیے انھیں اسٹیج کی باریکیوں اور لوازمات کا علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں شامل چاروں ڈراموں میں اسٹیج کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ ان ڈراموں میں نہ صرف ان کے پلاٹ کے زمانے کی عکاسی موجود ہے بلکہ موجودہ سماج اور اس کی نفسیات کیس اتھ ساتھ آج کا دور مکمل صورت میں سانسیں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس مجموعے کا پہلا ڈراما 'بزم داغ' مسلسل اسٹیج کیا جارہا ہے اور ہر پیش کش کے ساتھ اس کی معنویت میں اضافہ ہورہا ہے۔ اس لیے ان چاروں ڈراموں کو نہ صرف مکمل بلکہ کامیاب ڈراما کہا جاسکتا ہے اور پروفیسر ابن کنول کو ایک کامیاب ڈراما نگار۔

☆☆☆

جو گذرتے ہیں داغؔ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

ڈراما

بزمِ داغ

اہم کردار

نواب مرزا خاں داغؔ

نواب حسن علی خاں

نواب شمس الدین خاں

چھوٹی بیگم (وزیر بیگم) : داغ کی والدہ

مرزا فخرو : ولی عہد

بہادر شاہ ظفرؔ : بادشاہ

شیخ ابراہیم ذوقؔ

منی بائی حجاب

اختر جان، لطیف جان

شعرا: غالبؔ، مومنؔ، آزردہؔ، امیرؔ، اسیرؔ، جلالؔ وغیرہ

خدمتگار: جمال، چھمّن خاں وغیرہ

کچھ لڑکیاں، کچھ اور معاون کردار

منظر-1

(دیوان خانہ کا منظر ہے۔ قالین بچھے ہوئے ہیں۔
نقشین فرنیچر ہے۔ایک دیوار پر قد آدم آئینہ آویزاں ہے۔
گوشوں میں لیمپ جل رہے ہیں۔ روشنی بہت مدھم ہے۔
چاروں طرف خاموشی ہے۔ ایک جانب دیوار سے لگے
ہوئے دیوان پر گاؤ تکیے کا سہارا لیے ہوئے اضطرابی کیفیت
میں ایک بوڑھا کروٹیں بدل رہا ہے۔ سانولا رنگ، سفید
داڑھی، بڑھے ہوئے بال، کبھی کبھی آئینہ میں نگاہ اٹھا کر خود کو
دیکھتا ہے ۔بہت گہری سوچ میں ہے، پس منظر میں

گھنگروں اور غزل گانے کی آوازیں، رقص کے منظر گردش
کر رہے ہیں، بوڑھے کے چہرے پر نفرت کے آثار نمایاں
ہوتے ہیں۔ دانتوں کو بھینچتا ہے۔ سانس تیز ہو جاتی ہے۔
چہرہ پر غصہ نمایاں ہوتا ہے۔ اسی عالم غضب میں اٹھنے کی
کوشش کرتا ہے، پھر برابر رکھے ہوئے گلدان کو اٹھا کر پوری
طاقت سے آئینہ پر مارتا ہے۔ آئینہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا
ہے۔ سناٹے میں تیز آواز ابھرتی ہے۔ دیوان خانہ کے مختلف
دروازوں سے دو عورتیں اور دو مرد دوڑے ہوئے داخل ہوتے
ہیں۔ پہلے کمرے کا جائزہ لیتے ہیں۔ بوڑھا تکیے کا سہارا لے
کر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتا ہے۔ نوجوان عورت
(اختر جان) بوڑھے کے پاس جا کر دوز انو بیٹھتی ہے اور
پوچھتی ہے)

اختر جان: حضور! حضور کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟ آنکھیں کھولیے، یہ سب
کیسے ہوا؟

(بوڑھا آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتا ہے۔ اپنے اطراف نظریں دوڑاتا
ہے اور کہتا ہے)

بوڑھا: (آہ سرد بھر کے) کچھ نہیں۔ کبھی کبھی دیوانگی کا دورہ پڑتا ہے۔ اسی
کیفیت میں یہ سب کچھ ہو گیا۔

(اختر جان بوڑھے کی ہتھیلی سہلاتی ہے)

اختر جان: حضور کو کبھی کبھی نہیں، اکثر دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں۔

بوڑھا: ہاں اختری! جب تنہائی اور محرومی کا احساس گھیر لیتا ہے تو دیوانگی غالب آجاتی ہے۔

اختر جان: ایسا نہ کہیے بندہ نواز۔ آپ اور تنہائی اور محرومی؟ آپ تو نہ جانے کتنی محفلوں کی رونق ہیں۔ آپ تو سراپا انجمن ہیں۔ دیکھیے نواب حسن علی خاں صاحب آپ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے ہوئے ہیں۔

(پاس کھڑے ہوئے خوش پوش اور خوش شکل نواب حسن علی خاں بوڑھے کو سہارا دیتے ہیں)

بوڑھا: ارے حسن علی! (آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے) آپ کب آئے؟ آخر آپ بھی ہمارے دیوانہ پن کے گواہ بن گئے۔

حسن علی: میں نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر ہی ہوا تھا کہ آئینہ کے ٹوٹنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

بوڑھا: ارے ہاں! آئینہ ٹوٹ گیا۔ ہماری زندگی کی طرح بکھر گیا۔ جاؤ جمال الدین ان ٹکڑوں کو یکجا کرو۔

جمال الدین: جی حضور!

(خدمتگار جمال ٹوٹے ہوئے آئینہ کی طرف جاتا ہے۔ نواب حسن علی بوڑھے کے روبرو بیٹھ جاتے ہیں۔ اختر جان یہ کہتے ہوئے کھڑی ہوتی ہے)

اختر جان: چہرہ سلامت ہے تو آئینے ہزار پیدا ہو جاتے ہیں۔

بوڑھا: (طنزیہ مسکراہٹ) آئینہ تو دل کی طرح ٹوٹنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔ جب کوئی حسین اس کے روبرو جاتا ہے تو وہ اس کے حسن کی تمازت کی تاب نہیں لا پاتا۔ اور جب کوئی مجھ جیسا بدشکل اور بدنصیب اس کے سامنے آتا ہے تو اپنی کم نصیبی پر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔

حسن علی: نہیں حضرت! آئینہ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح بکھر جاتا ہے جب آپ جیسا فنکار اس کے روبرو ہوتا ہے۔ علم وفن کی حدت اس سے برداشت نہیں ہوتی۔

بوڑھا: نواب صاحب آپ باتیں خوب کرتے ہیں۔ آپ کی باتیں ہی ہمارے جینے کا سہارا ہیں۔ آؤ ہمارے نزدیک بیٹھو۔ ہم کچھ جینا چاہتے ہیں۔ اختری جان جاؤ بزم آراستہ کرو۔

اختر جان: جو حکم!

(اختر جان تسلیم کر کے چلی جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد بوڑھا یعنی نواب مرزا خاں داغ دہلوی اور نواب حسن علی قالین پر گاؤ

تکیوں کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ خدمت گار جمال حقہ تازہ کر کے چلا جاتا ہے۔ حقہ کا کش لینے کے بعد نواب حسن علی یوں گویا ہوتے ہیں)

حسن علی: مرزا صاحب! آپ کیوں اس قدر افسردہ و غمگین ہیں۔ پروردگار نے آپ کو ہر شے سے نوازا ہے۔ ہر ایک کو یہ عزت و وقار و مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ پورے ہندوستان میں آپ کی شاعری کے چرچے ہیں۔

(داغ آہ سرد بھرتے ہیں)

مرزا خاں: ہاں میاں! دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ حسن علی صاحب اپنے اندر کی تاریکی کو دور کرنے کے لیے خارجی قمقموں سے دل بہلانا پڑتا ہے۔ قدرت نے تو میرے اندر کی تاریکی کو میرے چہرے ہی پر نمایاں کر دیا ہے۔ میری روسیاہی تو جگ ظاہر ہے۔ خوبصورت ماں کا بدصورت بیٹا- اوپر والے نے بھی کیا خوب مذاق کیا ہے۔ شاید ماں کے گناہوں کی سیاہی میرے چہرے پر نمایاں کر دی ہے۔

حسن علی: ایسا نہ کہیں حضرت! قدرت نے آپ کو سب کچھ بخشا ہے۔ ایسے فن سے نوازا ہے جس پر لوگ رشک و حسد کرتے ہیں۔

مرزا خاں: (تمسخرانہ مسکراہٹ) نواب صاحب! آپ جیسے مخلصین کی وجہ سے ہی یہ پچھتر سال کا بوڑھا، بوڑھا نہیں ہو پاتا۔ آپ ہی تو زندہ رہنے کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ نواب صاحب اس کم بخت کو دیکھو، کلکتہ کی بائی۔ کیا نہیں کیا اس کے لیے۔ لیکن اس نے محسوس کرلیا کہ یہ آفتاب اب غروب ہونے والا ہے۔ بوڑھے کے دن پورے ہو چکے۔ اس کے ساتھ رہنے سے کیا فائدہ؟ اس عمر میں کہتی ہے نکاح کرلو۔ نواب صاحب میں اب جینا نہیں چاہتا۔ زندہ رہنے کی خواہش ہی ختم ہوگئی۔

حسن علی: خدا آپ کو سلامت رکھے، ایسا نہ کہیے۔ آپ کے ہزاروں شاگرد یتیم ہو جائیں گے۔

(بوڑھے مرزا خاں داغ نے دیوان خانہ کی چھت کی طرف دیکھا پھر ٹوٹے ہوئے آئینہ کو دیکھنے لگا)

مرزا خان: حسن علی دیکھ رہے ہو۔ یہ ٹوٹا ہوا آئینہ۔ جب تک یہ ثابت تھا اس میں صرف ایک شکل نظر آتی تھی اور اب اس کے ہر ٹکڑے میں ایک چہرہ نظر آتا ہے۔ میری زندگی بھی آئینہ کے ان ٹکڑوں کی طرح ہے۔ ہر ٹکڑے میں میری زندگی دکھائی دیتی ہے۔ میں کون ہوں؟ کیوں ہو؟ کیوں اس عالم آب وگِل میں بھیجا گیا؟ میں آج تک نہیں جان سکا۔

(مرزا خاں یہ کہہ کر خاموش ہوئے۔ حسن علی خاں ہمہ تن گوش تھے۔
کچھ توقف کے بعد)

مرزا خان: نواب حسن علی صاحب آپ جانتے ہیں۔ میری ماں ایک رنڈی
تھی۔- ہاں میں دانستہ یہ لفظ استعمال کر رہا ہوں - اور رنڈی کے
بارے میں تو کہا جاتا ہے:

رنڈی ہے نہ آشنا بشر کی
ہے صرف یہ دوست مال و زر کی
زر تک ہے بجان یہ تجھ پر مائل
جب زر نہ رہا تب اور در کی

حسن علی: حضرت مرحومہ کے لیے ایسا نہ کہیے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مرزا خاں: ہاں! ماں ہونے کے ناطے میں بھی آمین کہوں گا۔ لیکن اگر اس طرح
کے لوگوں کی بھی مغفرت ہونے لگی تو پھر کوئی مغفرت سے محروم
نہیں رہے گا۔

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ حسن علی مرزا خاں کے چہرے کا درد
محسوس کر کے اٹھنا چاہتے ہیں)

حسن علی: حضرت! اب مجھے اجازت دیجیے۔ میرا خیال ہے آپ آج آرام
فرمائیں۔

(مرزا خاں نے حسن علی خاں کا ہاتھ پکڑا)

مرزا خان: نہیں! آج آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ ہوسکتا ہے آج کے بعد ہم پھر کبھی نہ ملیں۔

حسن علی: ایسا نہ کہیں حضرت! آپ جب تک کہیں گے میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔

(خدمتگار جمال آ کر پھر حقہ تازہ کرتا ہے۔ ایک ملازمہ خشک میووں کے تھال رکھ جاتی ہے۔ مرزا خان پھر اپنا قصہ چھیڑتے ہیں)

مرزا خاں: نواب صاحب آپ کو اس بوڑھے اپاہج کی باتیں ناگوار خاطر گزر رہی ہوں گی۔ لیکن آج میں اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔

نواب صاحب! آپ کو شاید معلوم ہو۔ میری ماں بہت حسین تھی۔ کشمیر کی رہنے والی تھی نا۔ دلّی میں اس کے حسن کا شہرہ تھا۔ فرنگی بھی اسے نظر بھر کر دیکھنے کے خواہش مند رہتے تھے۔

(اسٹیج پر آہستہ آہستہ اندھیرا ہو جاتا ہے)

منظر۔ ۲

(مہرولی میں پھول والوں کی سیر کا میلہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی دوکانیں لگی ہوئی ہیں۔ کہیں قوالیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں لڑکیاں، کہیں لڑکے خریداری کر رہے ہیں۔ امرا، روٗسا، خواتین گھوم رہے ہیں ۔ ایک چوڑیوں کی دکان پر دو تین لڑکیاں دکاندار سے مول تول کر رہی ہیں ۔ برابر سے نوجوان نواب شمس الدین خاں کی سواری گزرتی ہے۔ لڑکیاں انھیں دیکھ کر چہ می گوئیاں کرتی ہیں۔ نواب شمس الدین

بھی کچھ دیر رک کر آگے بڑھتے ہیں۔ پھر ایک جگہ
رک جاتے ہیں)

شمس الدین: (ملازم سے) چھٹن خاں! وہ لڑکیاں کون ہیں؟

چھٹن خاں: کونسی حضور؟

شمس الدین: وہ جو چوڑی والے کی دکان پر ہمیں دیکھ کر چہ می گوئیاں کر رہی تھیں۔

چھٹن خاں: حکم ہو تو معلومات حاصل کروں۔

شمس الدین: ہاں ضرور۔ خصوصاً وہ سبز رنگ کا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ آپ معلوم کیجیے۔ ہم ذرا درگاہ پر فاتحہ پڑھ کر آتے ہیں۔

چھٹن خاں: جو حکم! (تسلیم کرتے ہوئے)

(دونوں مختلف سمت میں چلے جاتے ہیں)

منظر۔۳

(ایک کشادہ کمرہ۔ دیوان پر گاؤ تکیہ کا سہارا لیے نوجوان نواب شمس
الدین خاں بیٹھے ہیں۔ چھٹن خاں دروازے سے داخل ہو کر تسلیم
بجالاتا ہے)

شمس الدین: ہاں چھٹن! کیا خبر لائے؟

چھٹن خاں: حضور! پوری خبر لے کر خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

شمس الدین جلد کہو۔ آنکھوں میں ابھی تک اس شوخ ادا کا چہرہ گردش کر رہا
ہے۔ خدا قسم کیا حسن تھا۔

چھٹن خاں: حضور! چاندنی چوک ہی میں رہائش ہے۔ باپ کشمیری ہے، پیشہ

سادہ کاری اور ڈیرہ داری ہے۔ تین بہنوں میں سب سے چھوٹی۔ نام وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم۔ سنا ہے سب سے بڑی بہن نے جے پور میں کسی سے نکاح کیا ہے۔ منجھلی عمدہ بیگم رامپور کے نواب صاحب کے ولی عہد حضرت یوسف علی خاں صاحب کے یہاں رہتی ہیں۔

شمس الدین: ارے یہ بھی معلوم کیا کہ چھوٹی بیگم کسی سے وابستہ تو نہیں۔

چھٹن خاں　نہیں حضور! شاید آپ کی نظر عنایت کی منتظر ہیں۔

شمس الدین: تو پھر دیر کس بات کی ہے، یہ لو نذرانہ (اشرفی کی تھیلی لیتے ہوئے) جاؤ ہمارا پیغام پہنچاؤ اور ہمارے اشتیاق اور اضطراب کا اظہار کرو۔

چھٹن خاں: جو حکم سرکار!

(چھٹن خاں تسلیم کر کے چلا جاتا ہے۔ اسٹیج پر اندھیرا ہو جاتا ہے)

منظر۔۴

(ایک سادہ سے کمرے میں خوب صورت وزیر بیگم یعنی چھوٹی بیگم
تخت پر بیٹھی ہیں، ایک بوڑھی عورت اندر آتی ہے)

عورت: بی بی! کوئی چھٹن خاں نام کا آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

چھوٹی بیگم: کیوں بھلا؟

عورت: مجھے کیا معلوم بی بی۔ کہتا ہے بی بی صاحبہ ہی کو بتاؤں گا۔

چھوٹی بیگم: اے ہے، ایسا کون ہے؟ کوئی بھی منہ اٹھائے چلا آتا ہے، معلوم تو کرو کہاں سے آیا ہے۔

عورت: کسی نواب کا خادم لگتا ہے۔

چھوٹی بیگم: ہوگا

عورت: کیا کہوں بی بی؟

چھوٹی بیگم: اچھا بلاؤ۔۔کوئی کھا تھوڑے ہی جائے گا، ہے تو آدمی ہی کا بچہ۔

(عورت دروازے سے باہر جاتی ہے، تھوڑی ہی دیر میں چھٹن خاں کے ساتھ واپس آتی ہے، چھٹن خاں تسلیم کرتے ہیں)

چھوٹی بیگم: جی کہیے۔ کہاں سے آنا ہوا؟

چھٹن خاں: نواب صاحب نے بھیجا ہے۔

چھوٹی بیگم: کون سے نواب صاحب؟ یہاں تو ہر کوچے میں نواب رہتے ہیں

چھٹن خاں: جی نواب شمس الدین خاں والئ فیروز پور جھر کہ

چھوٹی بیگم: ان کو ہم سے بھلا کیا واسطہ؟ ہم تو ان سے کبھی ملے بھی نہیں۔ کیوں بوا

عورت: ہوسکتا ہے کہیں آپ کو دیکھا ہو۔

چھٹن خاں: جی! پھول والوں کے میلے میں آپ کو دیکھا تھا، اسی وقت سے ملنے کی خواہش لیے بیٹھے ہیں۔

چھوٹی بیگم. اوئی اللہ! آپ کے نواب صاحب میلے میں لڑکیاں دیکھنے جاتے ہیں۔

چھٹن خاں: جی نہیں! چوڑیوں کا مول تول کرتے وقت آپ ہی نے انھیں دیکھا تھا، اس لیے انھوں نے آپ

کو یاد کیا ہے، اور یہ نذرانہ بھیجا ہے۔

(تھیلی دیتے ہوئے، چھوٹی بیگم تھیلی لے لیتی ہے۔ کچھ سوچ کر)

چھوٹی بیگم: اچھا آپ باہر انتظار کیجیے، ہم ابھی تیار ہوتے ہیں۔

چھٹن خاں: جو حکم! (باہر چلا جاتا ہے)

منظر۔۵

(کشادہ کمرہ ہے۔نواب شمس الدین خاں دیوان پر تکیہ کا سہارا لیے
بیٹھے ہیں۔چھٹن خاں داخل ہوتا ہے)

چھٹن خاں: (تسلیم کرتے ہوئے) حضور چھوٹی بیگم شرفِ ملاقات کے لیے
تشریف لائی ہیں۔

(شمس الدین چونک کر اٹھتے ہوئے)

شمس الدین: تو انھیں فوراً اندر آنے کے لیے کہو۔

(چھٹن خاں دروازے سے باہر جاتا ہے۔نواب شمس الدین خود کو
درست کرتے ہیں۔تھوڑی ہی دیر میں سولہ سترہ سال کی وزیر بیگم

عرف چھوٹی بیگم چھٹن خاں کے ساتھ شرماتی لجاتی ہوئی اندر آتی ہیں
اور تسلیم بجالاتی ہیں)

شمس الدین: زہے قسمت۔ خوش آمدید۔ چھٹن میاں۔ مہمان کی تواضع کا انتظام کیجیے۔

چھٹن خاں: جو حکم! (باہر چلا جاتا ہے)

شمس الدین: آپ تشریف رکھیے۔ ہم مشکور ہیں آپ نے ہماری دعوت کو قبول کیا۔

(چھوٹی بیگم دیوان پر ہی بیٹھ جاتی ہیں)

چھوٹی بیگم: آپ جیسے قدر دانوں کی دعوت اور صحبت تو ہمارے لیے باعث افتخار ہے۔ اللہ گواہ ہے جب سے درگاہ قطب صاحب پر آپ کو دیکھا ہے، آپ سے ملاقات کا خواب آنکھوں میں لیے بیٹھے تھے۔ اللہ نے ہماری مراد پوری کی جو آج روبرو ہونا نصیب ہوا۔

شمس الدین. واللہ! آپ نے تو پہلی ہی نظر میں ہمیں قتل کر دیا تھا۔

چھوٹی بیگم: قتل ہوں آپ کے دشمن! ہماری ہزار جانیں آپ پر نثار۔

شمس الدین اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں۔

چھوٹی بیگم: للہ! ایسا کہہ کر گناہگار نہ بنایئے۔

شمس الدین. آرزو ہے کہ ہمہ وقت آپ ہمارے روبرو رہیں۔

چھوٹی بیگم: (شرماتے ہوئے) زہے قسمت! یہ بندی تو آپ کی باندی ہو چکی ہے۔ آپ کے حکم کی تابع ہے۔

شمس الدین: ہمارا حکم نہیں، خواہش ہے۔

چھوٹی بیگم: ہر خواہش قبول ہے۔

شمس الدین: چاندنی چوک میں ہمارا ایک مکان ہے، آج سے آپ وہیں قیام کیجیے۔

چھوٹی بیگم: عزت ونوازش کے لیے شکریہ۔ (تسلیم کرتے ہوئے)

شمس الدین: (آواز دیتے ہوئے) چھٹن میاں!

(اندر سے آواز آتی ہے)

چھٹن خاں: حاضر ہوا سرکار

(چھٹن خاں داخل ہوتا ہے)

چھٹن خاں: جی حضور!

شمس الدین: بیگم صاحبہ کو ہمارے چاندنی چوک کے مکان تک پہنچادو۔ آج سے ان کا قیام وہاں رہے گا۔ تمام ضروریات کا بندوبست کرو۔ ہم وہیں آتے ہیں۔

چھٹن خاں: جو حکم

(نواب شمس الدین چھوٹی بیگم کے ساتھ دروازے تک جاتے ہیں)

منظر۔۶

(مرزا خاں داغ اور نواب حسن علی کی گفتگو جاری ہے)

مرزا خاں. نواب صاحب! نواب شمس الدین خاں کے بخشے ہوئے اسی مکان میں میری ولادت ہوئی۔ میری ماں کا کہنا تھا کہ وہی میرے باپ ہیں۔

حسن علی: جی حضرت! میں واقف ہوں۔ نواب صاحب فیروز پور جھرکہ کے جاگیردار تھے۔ لیکن انگریز حکومت نے انھیں پھانسی کی سزا سنائی تھی۔

مرزا خاں جی ہاں! پھانسی کی سزا- میں اس وقت صرف چار برس ہی کا تھا۔

حسن علی: پھانسی کی وجہ کیا تھی؟

مرزا خاں ولیم فریزر کے قتل کی سازش میں ملوث پائے گئے۔ فریزر نے ان کی بہن کو بری نظر سے دیکھا تھا۔

حسن علی: اوہ! افسوس!

مرزا خاں کس بات کا؟ میرے یتیم ہونے کا یا نواب شمس الدین کی جوان موت کا۔ نواب شمس الدین کی موت میری دربدری کا سبب بنی۔ میری ماں نے ایک فرنگی جنرل مارسٹن بلاک کا سہارا ڈھونڈ لیا۔ پھر آغا تراب علی، پھر نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرّ رخشاں اور پھر ولی عہد بہادر مرزا فخرو کو مری سرپرستی نصیب ہوئی۔

حسن علی. حضرت! ان گذشتہ باتوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ۔۔ پروردگار نے اب آپ کو ہر شے سے نوازا ہے۔

مرزا خاں: نہیں نواب صاحب! نہ میرا ماضی مجھے فراموش کرتا ہے اور نہ میں ماضی کو فراموش کر پاتا ہوں۔ کاش میری ماں نے کسی غریب کا انتخاب کرکے ایک گھر بسالیا ہوتا اور میں حویلی کے بجائے کسی ٹوٹے مکان میں پیدا ہوتا تو ملال نہ ہوتا اپنے وجود سے شرمندہ نہ ہوتا۔

حسن علی: لیکن آپ نے تو بہت اچھا وقت قلعۂ معلیٰ میں گذارا۔ ولی عہد بہادر کی سرپرستی حاصل تھی۔

مرزا خاں: (طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے) نواب صاحب حویلی میں پیدا ہوکر کوئی نواب نہیں ہوجاتا۔ قلعہ کا ہر رہنے والا شاہزادہ نہیں ہوتا۔ میرا نام ابراہیم رکھا گیا لیکن میں نے اسے تبدیل کرلیا۔ جانتے ہیں کیوں؟

اس لیے کہ میں نہ کہیں کا نواب تھا، نہ امیر، نہ وزیر، نہ کوئی
جاگیردار۔ ایک نواب کی ناجائز اولاد– میں نے اپنا نام ہی نواب
مرزا خاں رکھ لیا۔ میں خود ساختہ نواب ہوں– ذلتوں سے بچنے کے
لیے۔ اپنے ہم عمروں کے فقروں سے تنگ آ کر۔ کہتے تھے تم اس
سماج پر بدنما داغ ہو۔ میں نے تخلص ہی داغ رکھ لیا۔ واقعی میں
سماج پر بدنما داغ ہوں۔

(کچھ وقفہ کے بعد)

نواب حسن علی خاں صاحب! میں نے انتقاماً وہ راستہ اختیار کیا جو میری ماں
نے کیا تھا۔ میری ماں نے نہ جانے کتنے مردوں سے رشتے قائم
کیے۔ میں نے عورتوں سے رشتے قائم کر کے انتقام لیا۔

(ایک دروازے سے خدمتگار جمال داخل ہوتا ہے)

جمال حضور! کافی وقت بیت چکا ہے۔ اجازت ہو تو دسترخوان لگا دیا جائے۔

حسن علی: آپ تناول فرمایئے۔ مجھے اجازت دیجیے۔

مرزا خاں نہیں ابھی آپ کو اجازت نہیں ملے گی۔ جمال میاں ابھی کھانے کی
خواہش نہیں ہے۔

(جمال حقہ تازہ کر کے چلا جاتا ہے۔ پس منظر میں غزل کی آواز آتی ہے۔ دونوں
خاموش بیٹھے ہیں۔)

حسن علی: یہ کس کی آواز ہے؟

مرزا خاں: شاید لطیف جان ریاض کررہی ہیں۔

(غزل کے دو تین شعر کے بعد پھر مکالمہ شروع ہو جاتا ہے)

مرزا خاں: نواب صاحب! میں نے بہت مجبور زندگی گزاری ہے۔ میں ہر جگہ ماں کے ساتھ جانے کے لیے مجبور تھا۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ قلعۂ معلیٰ میں میں نے شاہی زندگی گزاری۔ بادشاہت تھی ہی کہاں؟۔ بادشاہ کے پاس ہی دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ان کا ولی عہد کیا دیتا۔ صرف خطابات۔ لوگ خوش ہوتے تھے۔ بادشاہ نے خطاب سے نوازا۔ میری ماں کو شوکت محل کا خطاب ملا۔ صرف شوکت محل ۔ نہ محل تھا، نہ شوکت۔ وظیفہ خوار بوڑھا بادشاہ۔ نااہل اور عیاش شاہزادے۔ ہر طرف سازشیں۔ جانتے ہیں حسن علی صاحب! میری زندگی کو برباد کرنے میں قلعہ معلیٰ کا قیام ہے۔ وہاں کے ماحول نے مجھے بگاڑ دیا۔ ہر طرف رقص و سرود۔ طاؤس و رباب۔ اور کوئی شغل نہیں تھا۔

منظر۔ ۷

(قلعۂ معلی - اِدھر اُدھر دوڑتی ہوئی نوخیز لڑکیاں - شاہزادوں کی چھیڑ چھاڑ - رقص کی محفلیں - ایک جانب رقص کی محفل آراستہ ہے۔ کچھ شاہزادے لطف اندوز ہورہے ہیں۔ ایک تیرہ چودہ سال کا سانولا سا لڑکا ایک ستون کی آڑ میں کھڑا یہ منظر دیکھ رہا ہے۔ رقاصہ ناچ رہی ہے۔ پاس دوعورتیں گذرتی ہیں، ستون کی آڑ میں کھڑے لڑکے کو دیکھ کر باتیں کرتی ہیں)

ایک عورت: اے بی! یہ لونڈا کون ہے؟ یوں چھپ چھپ کے ناچ دیکھ رہا ہے۔

دوسری عورت: اے لو! تمہیں نہیں مالوم- صاحب عالم جس عورت کو محل میں لے کر آئے ہیں اس کی اولاد ہے۔

پہلی عورت: تو کیا وہ اتنی بڑھیا ہے۔ ہمارے صاحب عالم کی تو ابھی عمر ہی کیا ہے۔

دوسری عورت: ہاں بی بی - سنا ہے صاحب عالم سے بہت بڑی ہے۔ کئی بچے ہیں اس کے - لیکن یہ نہیں مالوم کس کس کے ہیں۔

پہلی عورت: ارے توبہ! کیا قلعہ میں شاہزادیوں کا قحط تھا۔

دوسری عورت، بی بی - خوبصورت بہت ہے۔ بس دل آ گیا۔ بچوں کے ساتھ محل میں لے آئے۔ ملکۂ عالم تو خار کھائے بیٹھی ہیں۔

(عورتیں باتیں کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ منظر بدل جاتا ہے)

منظر۔۸

(ایک کشادہ کمرے میں مسہری پر نوجوان مرزا فخرو اور چھوٹی بیگم بیٹھے باتیں کررہے ہیں)

مرزا فخرو: آپ نے جب سے محل میں قدم رکھا ہے، یہاں کی رونق دو بالا ہوگئی ہے۔

چھوٹی بیگم: یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے اس ناچیز کو یہ عزت بخشی۔ ورنہ خاک کو آسماں سے کیا نسبت۔

مرزا فخرو: نواب مرزا کہاں ہیں؟

چھوٹی بیگم: شاید باہر ہوں گے۔

مرزا فخرو: بہت باذوق لڑکا ہے۔ زبان بہت اچھی استعمال کرتا ہے۔

چھوٹی بیگم: جی ہاں! پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ رامپور میں مولوی غیاث الدین نے فارسی کی ابتدائی تعلیم دی ہے۔ حضور نواب یوسف علی خاں صاحب نے سکندر نامہ پڑھایا ہے۔

مرزا فخرو: یہ تو اچھی بات ہے۔ میر احمد حسین قلعہ میں شاہزادوں کو پڑھانے آتے ہیں۔ ان سے فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم کہہ دیں گے۔

چھوٹی بیگم: بہت شکریہ! نوازش! ابھی سے طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہے۔

مرزا فخرو: بہت خوب! کبھی ہم اپنے استاد حضرت ذوق سے ملاقات کروا دیں گے۔

چھوٹی بیگم: یہ تو بہت اچھا ہوگا۔

مرزا فخرو: اگر انہیں سپہ گری کا شوق ہوگا تو ہم انہیں بندوق چلانا بھی سکھا دیں گے۔ قلعہ کے شاہزادوں کو تو سپہ گری سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ ان سے کہیے کہ وہ یہاں خود کو کسی سے کمتر محسوس نہ کریں۔

چھوٹی بیگم: اس نوازش کے لیے شکریہ

منظر-۹

(نوجوان نواب مرزا خاں چند کمسن لڑکیوں کے درمیان بیٹھے ہیں۔ لڑکیاں مرزا
خان کی صحبت سے لطف اندوز ہورہی ہیں۔ مرزا خان انھیں چھیڑ
بھی رہے ہیں اور شعر بھی سنا رہے ہیں۔ خوب کھلکھلا رہے ہیں۔
لڑکیاں ناز و ادا سے فرمائشیں کر رہی ہیں)

ایک لڑکی: مرزا ہمارے لیے کوئی شعر کہو۔

مرزا خاں کیوں؟ آپ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟

لڑکی: ذرا غور سے دیکھیے (اپنا چہرہ دکھاتے ہوئے)

مرزا خاں: دور سے دیکھ کر اس کی تازگی کا احساس کیسے ہوگا۔ جب تک چھو کر نہ
دیکھا جائے۔

لڑکی:　(شرماتے ہوئے) تو منع کس نے کیا ہے۔

مرزا خاں:　اچھا شعر سنو!

اک آفتِ زمانہ لڑکپن میں ہے وہ شوخ
کیا ہوگا جب کہ آئے گا عالم شباب کا

دوسری لڑکی:　مرزا ہم بھی تو منتظر ہیں تمہاری نگاہ کے۔

مرزا خاں:　سبحان اللہ (رخسار چھوتے ہوئے)

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

دوسری لڑکی:　ہائے اللہ!

تیسری لڑکی:　ہماری آنکھوں کی جانب بھی تو نظر کیجیے۔ آپ کے لیے محبت ہی محبت ہے۔

مرزا خاں:　واللہ!

ہر نگہ میں فتنہ ہے، ہر فتنے میں محشر بپا
شوخیاں چھین لیں، تری آنکھوں نے بھی رفتار کی

چوتھی لڑکی:　مرزا صاحب! ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں۔

مرزا صاحب　آپ بھی ہماری نظروں کی زد میں ہیں۔

ہم ایک کے پابندِ محبت نہیں ہوتے
ہے رنگ طبیعت کا کہیں اور کہیں اور

پہلی لڑکی (اٹھلاتے ہوئے) ہمارے لیے کچھ اور کہیے

مرزا خاں: (مسکراتے ہوئے)

جو مرے دل میں ہے کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے

گدگدالوں تو کہوں پاؤں دبالوں تو کہوں

لڑکی: ہائے اللہ! آپ تو بڑے بے شرم ہیں (شرماتے ہوئے)

مرزا خاں: بے شرمی تو ہمارے خمیر میں شامل ہے۔

ہمیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دیکھیں گے

تمھیں ہے شرم تو آنکھوں پر ہاتھ دھر لینا

(اچانک لڑکیوں میں کھلبلی مچتی ہے۔ اٹھ کر ادھر اُدھر جانے لگتی ہیں)

لڑکیاں: (گھبرائے ہوئے انداز میں) صاحب عالم آرہے ہیں۔

(لڑکیاں وہاں سے مرزا فخرو کو تسلیم کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ مرزا خاں اکیلے رہ جاتے ہیں۔ مرزا فخرو کو آداب کرتے ہیں)

مرزا فخرو: کہیے۔ سنا ہے آپ کو شعر گوئی کا شوق ہے۔ کبھی ہمیں بھی سنایئے گا۔

مرزا خاں ضرور۔ یونہی تک بندی کر لیتے ہیں۔

مرزا فخرو: اچھا ہے۔ کبھی استاد محترم حضرت ذوق سے آپ کو ملوائیں گے۔ آپ ان سے اصلاح لیجیے۔ ہمارے کلام پر بھی وہی اصلاح فرماتے ہیں۔

مرزا خاں: زہے قسمت۔

(ایک خدمت گار اندر داخل ہوتا ہے)

خدمتگار (تسلیم کرتے ہوئے) حضور! استاد ذوق تشریف لائے ہیں۔

مرزا فخرو: انھیں عزت سے اندر لائیے۔

(خدمت گار چلا جاتا ہے۔ مرزا خاں کی طرف مخاطب ہو کر)

لیجیے- خوش قسمت ہیں آپ- استاد تشریف لے آئے۔

(استاد ابراہیم ذوق اندر آتے ہیں۔ مرزا فخرو اور نواب مرزا خاں تسلیم کرتے ہیں۔

پھر تینوں بیٹھ جاتے ہیں)

ذوق (فخرو سے) یہ صاحب زادے کون ہیں؟

مرزا فخرو: یہ نواب مرزا خاں ہیں۔ پہلے یہ بھی ابراہیم تھے۔ فیروز پور جھرکہ کے نواب شمس الدین خاں مرحوم کی اولاد ہیں۔ اب ہماری سرپرستی میں ہیں۔

ذوق: اچھا اچھا- یہ چھوٹی بیگم کے صاحب زادے ہیں۔ ان کے ساتھ قلعہ میں تشریف لائے ہیں۔ (چہرے پر تھوڑی سی ناگواری)

مرزا فخرو: شعر گوئی کا شوق رکھتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ ان کے کلام پر بھی اصلاح فرمادیا کریں۔

(ذوق کچھ دیر خاموش رہتے ہیں)

ذوق: صاحب زادے! کس کس کا کلام پڑھا ہے؟

مرزا خاں: بیشتر اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔

ذوق: کچھ اپنے اشعار سنایئے۔

مرزا خاں: جو حکم - پیش خدمت ہیں چند اشعار:

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا

تمام رات قیامت کا انتظار کیا

تجھے تو وعدۂ دیدار مجھ سے کرنا تھا

یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا

ذوق: خوب - سبحان اللہ - اچھا کہتے ہو۔ زبان پر گرفت ہے۔

مرزا خاں (تسلیم کرتے ہوئے) حوصلہ افزائی کے لیے شکریہ۔ عرض کیا ہے۔

مرزا فخرو: ارشاد

مرزا خاں: توجہ کا طالب ہوں

ہم ایسے محو نظارہ نہ تھے کے کہ ہوش آتا

مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا

رقیب و شیوۂ الفت، خدا کی قدرت ہے

وہ اور عشق بھلا تم نے اعتبار کیا

ذوق بہت اچھا۔ کیا تخلص فرماتے ہیں، صاحب زادے؟

مرزا خاں: ابھی تو مرزا ہی استعمال کرتا ہوں۔

(مرزا فخرو کچھ سوچ کر)

مرزا فخرو: میرا خیال ہے، 'داغ' تخلص بہتر ہے۔

ذوق: صحیح فرمایا شاہزادے 'داغ' ہی مناسب ہے۔

مرزا خاں: شکریہ۔ ناچیز کی زندگی کی مناسبت سے 'داغ' ہی بہتر ہے۔

(ذوق اور فخرو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

مرزا فخرو: نہیں میاں۔ ہمارا وہ مطلب نہیں تھا۔

مرزا خاں: حضور! اس طرح کی باتوں سے ہمیں کانٹوں میں نہ گھسیٹیے۔ ہمیں آپ کا دیا ہوا تخلص بہت پسند آیا۔

ذوق: ٹھیک ہے۔ آج سے آپ 'داغ' دہلوی کہلائیں گے۔ آپ اپنا کلام ہمیں دکھائیے۔ شاہزادے اب قلعہ میں جب بھی مشاعرہ ہوگا، داغ بھی شرکت کریں گے اور اپنا کلام بادشاہ سلامت کے روبرو پیش کریں گے۔

مرزا فخرو: حضور!

مرزا خاں: (تسلیم کرتے ہوئے) زہے قسمت!

مرزا فخرو: (کچھ یاد کرتے ہوئے) استاد جشن نوروز کے موقع پر قلعہ میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوگا۔ اعلیٰ حضرت نے ایک مصرع طرح بھی مقرر فرمایا ہے۔ 'بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے'

ذوق: بہت بہتر۔ مرزا خاں داغ بھی وہاں اپنی غزل پیش کریں گے۔

مرزا خاں: جو حکم

(تینوں اٹھ کر چلے جاتے ہیں)

منظر۔۱۰

(وہی کشادہ کمرہ۔ مدھم روشنی۔نواب مرزا خاں داغ اور نواب حسن علی خاں محوِ گفتگو)

مرزا خاں: واقعی میں اس سماج کا ایک بدنما داغ تھا۔اسی لیے میرا تخلص بھی داغ تجویز کیا گیا۔

حسن علی: لیکن یہ تخلص تو آپ کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا۔آج دنیا میں آپ کا شہرہ ہے۔ ہزاروں آپ کے قدرداں ہیں۔

مرزا خاں: جی ہاں! قدر اس وقت بھی تھی۔ بس زندگی داغدار تھی۔ نواب صاحب! قلعہ کی زندگی نے ہمیں لہو و لعب، رقص و سرود کا عادی بنادیا۔ ہماری ماں نے پندرہ سال ہی کی عمر میں ہماری شادی بھی

کردی۔ اپنی بہن کی اس بیٹی سے جو والیِ رامپور نواب یوسف علی خاں کی بیٹی تھی۔ نواب شمس الدین خاں کا بیٹا، نواب یوسف علی خاں کی بیٹی- لیکن قسمت میں کاسۂ گدائی۔ اس لیے کہ وراثت کے دونوں جائز مستحق نہیں تھے۔

حسن علی: لیکن قسمت نے آپ کو اس دولت سے نواز جو کسی شاہزادے کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔

مرزا خاں. جی ہاں! شعر گوئی ہی نے ہماری رسوائیوں اور ذلتوں کے تمام داغ دھوڈالے۔

اے داغؔ ہے ایسی تیرے اشعار میں گرمی
سن کر جسے آجائے سخنور کو پسینا

حسن علی: صحیح فرمایا- یہ حقیقت ہے:

داغؔ سا بھی کوئی شاعر ہے ذرا سچ کہنا
جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی، بات نئی

مرزا خاں آپ بھی ہماری دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ بادشاہ سلامت حضرت بہادر شاہ ظفر بھی ہماری غزل سن کر بہت محظوظ ہوتے تھے۔ ہماری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ مرزا غالب نے بھی داد سے نوازا تھا۔ قلعۂ معلی کا وہ یادگار مشاعرہ تھا۔

منظر۔۱۱

(قلعہ کا دیوان عام- مشاعرہ کی محفل آراستہ ہے۔ بادشاہ ظفر، ولی عہد مرزا فخرو،
ذوق، غالب، مومن وغیرہ موجود ہیں۔ شمع روشن ہے۔ یکے بعد
دیگرے ایک خادم شمع شعرا کے سامنے رکھتا تھا اور شاعر اپنا کلام
پیش کرتے تھے۔ جب شمع نواب مرزا خاں
داغ کے سامنے جاتی ہے)

بہادر شاہ ظفر: یہ نوجوان کون ہے؟

ذوق حضرت یہ نواب مرزا خاں ہیں۔ داغ تخلص ہے۔ انھیں ولی عہد کی
سرپرستی حاصل ہے۔

بہادر شاہ ظفر: صاحب زادے بسم اللہ کیجیے۔

نواب مرزا: (تسلیم کرتے ہوئے) شکریہ! مطلع عرض ہے۔

نکال اب تیر سینے سے کہ جان پر الم نکلے

جو یہ نکلے، تو دل نکلے، جو دل نکلے تو دم نکلے

(سبحان اللہ، واہ واہ کی صدائیں گونجتی ہیں)

رہِ الفت میں اک سیدھا سا رستہ ہم نے جانا تھا

مگر دیکھا تو اس رستہ میں صدہا پیچ و خم نکلے

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی

کسی کا اس طرح یا رب نہ دنیا میں بھرم نکلے

سمجھ کر رحم دل تم کو دیا تھا ہم نے دل اپنا

مگر تم تو بلا نکلے، غضب نکلے، ستم نکلے

(واہ واہ۔ سبحان اللہ کی صدائیں گونجتی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر اپنے پاس بلاتے ہیں)

بہادر شاہ: صاحب زادے یہاں تشریف لایئے۔

(مرزا خاں اٹھ کر جاتے ہیں۔ بہادر شاہ پیشانی پر بوسہ دیتے ہیں)

آپ کی شاعری کے تیور اور انداز بتا رہے ہیں کہ آپ کو بہت مقبولیت حاصل ہوگی۔

(مرزا خاں تسلیم کرکے اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں)

منظر۔۱۲

(نواب مرزا خاں اور نواب حسن علی محوِ گفتگو)

مرزا خاں: قلعہ میں ہماری شاعری نے ہمیں بہت عزت بخشی۔ لیکن یہ سیاہ رو سیاہ بخت بھی تھا۔ خوشیاں بہت کم وقت تک ہی ساتھ نبھاتی ہیں۔ پہلے استاد محترم ذوق دنیا سے رخصت ہوئے۔ پھر فتح الملک ولی عہد بہادر مرزا فخرو جو ہمارے سرپرست تھے، دنیا سے کوچ کر گئے۔ ہم ایک بار پھر یتیم ہو گئے۔ دربدری پھر ہمارا مقدر بنی۔ قلعہ معلیٰ کو ہمیشہ کے لیے

خیر باد کہنا پڑا۔

حسن علی: قدرت جو کرتی ہے۔ بہتر ہی کرتی ہے۔ آپ کے حق میں اچھا ہی ہوا۔

مرزا خاں جی ہاں! بہت اچھا ہوا۔ جو غدر سے ایک سال قبل ہی ہم قلعہ سے باہر آ گئے۔ ورنہ وہی حشر ہوتا جو قلعہ میں رہنے والوں کا ہوا۔ قید ہوتے یا پھانسی پر لٹکا دیے جاتے۔ کیا قیامت کا منظر تھا۔ اللہ کی پناہ۔

منظر۔۱۳

(مختلف مناظر)

ہندوستانیوں اور فرنگیوں کی لڑائی کا منظر۔

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کا منظر۔

جگہ جگہ پھانسی پر لٹکتے ہوئے ہندوستانی۔

منظر۔۱۴

(جامع مسجد کے کچھ پتھروں کے ملبہ پر دو شخص بیٹھے باتیں کر رہے ہیں)

پہلا آدمی: دلّی کو تباہ کر دیا ان گوروں نے۔

دوسرا آدمی: ہاں میاں! ہر گلی ویران- ہر کوچہ سنسان ہے۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایسی تباہی تو دلّی نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔

پہلا آدمی: کتنے ارمانوں سے شاہ جہاں آباد کو آباد کیا تھا۔ سب برباد کر دیا۔ نہ بادشاہ رہے، نہ شاہزادے۔ خاندان ہی ختم ہو گیا۔

دوسرا آدمی: میاں شہر میں کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ سب دلی چھوڑ گئے یا مار دیے گئے۔ ان بندر جیسے منہ والے گوروں نے دلّی کو لوٹ لیا۔

پہلا آدمی ساری محفلیں ختم ہو گئیں۔ نہ غزل گانے والے ہیں۔ نہ کہنے والے۔ اور نہ سننے والے۔ ہر طرف ہو کا عالم۔

دوسرا آدمی: بھائی سنا ہے، مرزا نوشہ نے تو اپنی جان کسی طرح بچالی لیکن وہ

نواب مرزا خاں کہاں ہیں۔

پہلا آدمی: ارے وہی جو قلعہ سے نکال دیے گئے تھے اور داغ تخلص رکھتے ہیں۔

دوسرا آدمی: وہ تو شاید رامپور چلے گئے۔نواب رامپور کے یہاں ان کی خالا رہتی ہیں نا۔ یار ان لوگوں کے بھی مزے ہیں، کہیں نہ کہیں ٹھکانہ مل ہی جاتا ہے۔لیکن جو بھی ہے شاعری ان کی خوب ہے۔

پہلا آدمی: ہاں یہ تو ہے۔ بڑی کم عمری میں شہرت پالی۔ وہ کیا شعر– ہاں وہ:

لے چلا جان مری، روٹھ کے جانا تیرا
ایسے آنے سے تو بہتر تھا، نہ آنا تیرا

دوسرا آدمی: آسان زبان میں شعر کہتے ہیں۔ اس لیے مقبول ہیں ۔ کیا شعر کہا ہے مرزا نے:

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

ٹوک کر رستے میں، پیار آ ہی گیا اس شوخ پر
وہ نظر حیرت زدہ ، وہ آنکھ شرمائی ہوئی

پہلا آدمی: (آہ بھرتے ہوئے) ہاں یار! اب دلّی کی محفلیں ہی سونی ہو گئیں۔ سارے اہلِ فن دلّی چھوڑ گئے۔ ہم جیسے نااہل رہ گئے۔

(دونوں اٹھ کر ایک طرف چلے جاتے ہیں)

منظر۔۱۵

(نواب مرزا خاں اور نواب حسن علی کی گفتگو جاری ہے)

مرزا خاں: نواب صاحب مغلیہ حکومت کو تو ختم ہونا ہی تھا۔ بابر و اکبر کے جانشین اس لائق بھی نہیں رہ گئے تھے کہ تلوار کا بوجھ اٹھا سکیں۔ سب کے سب نااہل اور عیاش۔

حسن علی: مرزا صاحب! مغلیہ سلطنت تو شہنشاہ عالمگیر کی وفات کے بعد ہی ختم ہوگئی تھی۔

مرزا خاں بالکل صحیح فرمایا۔ اگر شہنشاہ عالمگیر گولکنڈہ کا محاصرہ کرنے کے بجائے دلّی کی طرف توجہ دیتے تو سلطنت اس طرح نہیں بکھرتی۔ عظیم الشان سلطنت کا عبرت ناک انجام۔ انواب صاحب غدر کے

بعد دلّی برباد ہوگئی، کیا دلّی تھی، ہر کوچہ ورق مصور اور ہر گھر رشک ارم

داغ دلّی تھی کسی وقت میں یا تخت تھی
سینکڑوں گھر تھے وہاں ایک نہ دو

اگر والیانِ رامپور اور حیدرآباد نہ ہوتے تو ہم جیسے شاعر دلّی کے گلی کوچوں میں بھیک مانگتے پھرتے۔

حسن علی: بجا فرمایا۔ والیان حیدرآباد کے بڑے احسانات ہیں، اللہ انھیں اور ان کی سلطنت کو قائم ودائم رکھے۔

مرزا خاں: آمین! حسن علی خاں صاحب! گذشتہ وقت کو یاد کر کے آنکھوں سے لہو بہنے لگتا ہے۔

حسن علی: نظر انداز کیجیے حضرت ماضی کو۔ آج آپ کے ہزاروں قدرداں ہیں۔ حضور نظام بھی آپ کا احترام کرتے ہیں۔ آپ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے ہیں۔

مرزا خاں: ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن جو قومیں اور افراد اپنے ماضی کو فراموش کر دیتے ہیں وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ میں کیسے بھول سکتا ہوں اپنے ماضی کو۔ آدمی سرپرستی سے محروم ہو تو کیا کیا رسوائیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ معلوم ہے والی رامپور نے میرے ساتھ کیا مذاق کیا۔ اصطبل کی نگرانی میرے سپرد کر دی تا کہ گھوڑوں کو دیکھ دیکھ کر شعر

کہوں۔ کہاں قلعۂ معلیٰ میں حسیناؤں کے درمیان تھا۔

حسن علی: (مسکراتے ہوئے) حضرت گھوڑوں سے تو بڑے بڑے بادشاہوں نے محبت کی ہے۔

مرزا خاں: جی صحیح فرمایا، ہماری اوقات ہی یہ تھی کہ جانوروں سے محبت کریں۔ والیِ رامپور نے ہماری اوقات کی مناسبت ہی سے ہمیں اس عہدے سے نوازا تھا۔ نواب صاحب میں نے جس قدر تجربات رامپور کے زمانۂ قیام میں حاصل کیے۔ کبھی نہیں کیے۔ رامپور نے میری زندگی کو سانچے میں ڈھال دیا اور میرے سارے کس بل نکال دیے۔ جانتے ہیں اس وقت کسی دل جلے نے یہ شعر کہہ کر اصطبل کے دروازے پر چسپاں کر دیا تھا:

شہر دہلی سے آیا ایک مشکی

آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

(نواب مرزا خاں کا سانس پھولنے لگتا ہے۔ نواب حسن علی خاں شربت کا گلاس آگے بڑھاتے ہیں)

حسن علی: لیکن رامپور سے تو آپ کی بڑی حسین یادیں بھی وابستہ ہیں۔

مرزا خاں: جی ہاں! یادیں نہیں بلائیں۔ آج تک اس سے نجات نہیں ملی۔ آپ تو سب جانتے ہیں۔

منظر۔۱۶

(بے نظیر باغ میں میلے کا منظر۔ ہر طرف شور و غل۔ تین چار دوست ایک ساتھ گھوم رہے ہیں جن میں نواب مرزا خاں، جلال، منیر اور اسیر وغیرہ شامل ہیں۔ سب کی عمر پچاس کے آس پاس ہے۔ باتیں کر رہے ہیں)

اسیر: نواب صاحب نے اس میلے کا انعقاد کر کے تفریح کا ایک اچھا ذریعہ پیدا کر دیا ہے۔

نواب مرزا واقعی یہ بے نظر باغ بے نظیر ہو گیا ہے۔ ہر فن کے ماہر یہاں نظر کر رہے ہیں۔ سنا ہے نواب صاحب نے کچھ گانے والیوں کو بھی

یہاں بلایا ہے۔

منیر: ہاں بھئی! کلکتہ سے کوئی مُنّی بائی آئی ہے۔ سنتے ہیں بلا کی خوبصورت ہے اور آواز میں بڑا جادو ہے۔

امیر: میں نے تو سنا ہے شعر گوئی کا بھی شوق ہے اور حجاب تخلص ہے۔

نواب مرزا: ارے پھر دیر کس بات کی ہے۔ چلئے۔ وہیں چلتے ہیں۔

(چاروں مُنّی بائی کا گانا سننے کے لئے جاتے ہیں)

(مُنّی بائی کی محفل سجی ہوئی ہے۔ چاروں وہاں پہنچتے ہیں۔ ان کا استقبال ہوتا ہے۔ وہاں بیٹھتے ہیں۔ مُنّی بائی غزل شروع کرتی ہے۔ جو نواب مرزا خاں داغ ہی کی ہے۔ غزل کا مطلع سنکر چاروں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

غزل:

ترے وعدہ کو بت حیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے
کبھی شام ہے، کبھی صبح ہے، کبھی صبح ہے کبھی شام ہے

وہ ستم سے ہاتھ اٹھائے کیوں، وہ کسی کا دل نہ دکھائے کیوں
کوئی اس میں مر ہی نہ جائے کیوں، اسے اپنے کام سے کام ہے

دل و دیں کا جس کو نہ پاس ہو، یہی نامراد ہے دیکھ لو
جسے داغؔ کہتے ہیں اسے بتو، اسی رو سیاہ کا نام ہے

(مقطع گاتے وقت منّی بائی داغ کی طرف انگلی اٹھاتی تھی۔ حاضرین لطف اندوز ہوتے تھے۔ محفل ختم ہوتی ہے۔ سب اٹھ کر جانے لگتے ہیں۔ مرزا خاں اٹھتے نہیں۔ ان کے ساتھی اٹھتے ہیں)

منیر: ارے اٹھیے مرزا صاحب۔ محفل برخواست ہوگئی۔

مرزا خاں: اب کون کم بخت یہاں سے جائے گا۔ کیا آواز ہے۔ کیا صورت ہے۔ سبحان اللہ

اُف رے عہد شباب کی مستی
لے لیے ہے شراب کی مستی
ہائے تیرا کلام مستانہ
ہائے تیرا خرام مستانہ

(ایک خدمت گار داغ کے پاس آتا ہے)

خدمتگار: حضور! محفل اختتام کو پہنچی۔ اب کل تشریف لایئے گا۔

مرزا خاں: بائی جی کو یہ پیغام دو:

مجرم عشق کو کیا حکم ہے اے داور حشر
داغ جنت میں رہے یا کہ جہنم میں رہے

خدمتگار: حضور! بائی جی اب کسی سے......

(جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ منّی بائی ایک جانب سے داخل ہوتی ہے)

منّی بائی

داغؔ تم آئے تھے بزم عیش میں خوش خوش ابھی
کیا ہوا کس واسطے افسردہ خاطر ہوگئے

(منّی بائی کو دیکھ کر نواب مرزا خاں اٹھتے ہوئے)

مرزا خاں سبحان اللہ- زہے قسمت

جسے داغ کہتے ہیں اے بتو،
اسی روسیاہ کا نام ہے

منّی بائی: ہم تو مدت سے آپ کے کلام کے شیدائی ہیں۔ بہت آرزو تھی کہ کبھی روبرو ہوں۔ سو پروردگار نے وہ آرزو بھی پوری کی۔

مرزا خاں: لیکن ہمارے دل میں تو آرزوئیں جگادیں

تیرے انداز وہ کافر ہیں، بہت ہوش رُبا
آدمی کیا جو فرشتہ ہو تو شیدا ہوجائے

منّی بائی:

آتش شوق کو کب دل سے جدا رکھا ہے
اس لگی کو تو کلیجے سے لگا رکھا ہے

مرزا خاں اجازت دیجیے کہ ہم روز آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوسکیں۔

منّی بائی: زہے نصیب۔

آنکھیں، بچھائیں ہم تو عدو کی بھی راہ میں
پر کیا کریں کہ تو ہے ہماری نگاہ میں

مرزا خاں: شکریہ!

(اجازت لیتے ہوئے)

تری گلی سے نکلنا ہمیں قیامت ہے۔ لیکن ہمارا زیادہ دیر قیام تمہاری رسوائی کا سبب ہوسکتا ہے۔ کل پھر حاضر ہوتے ہیں۔

منی بائی رسوائی کا خوف تو آپ جیسے شرفا کو ہوتا ہے۔ ہمارا اور رسوائی کا ساتھ تو چولی دامن کا ہے۔

مرزا خاں: (مضحکہ خیز ہنسی) کیسے شرفا؟ کہاں کے شرفا؟

جو گذرتے ہیں داغؔ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

منی بائی ہمیں تو آپ کی غزلوں نے رسوا کیا ہے۔ کلکتہ کے گلی کوچوں میں آپ کی غزلوں کو عام کیا ہے۔ ہم نے تو آپ کو دیکھ لیا۔ اب اہل کلکتہ آپ کے منتظر ہیں۔

مرزا خاں: جزاک اللہ۔ ہم سے پہلے کلکتہ میں آپ نے ہماری رسوائی کا سامان کردیا۔

زندگی شرط ہے تو آئیں گے لطف

صحبت کا پھر اٹھائیں گے

اب اجازت۔کل ملاقات کو پھر آئیں گے۔اور محفل میں نہیں خلوت میں دل کا حال کہیں گے۔شب بخیر

منی بائی: (تسلیم کرتے ہوئے) شب بخیر۔

منظر۔۱۷

(ایک ہال میں نواب مرزا خاں داغ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ جن میں امیر مینائی، جلال شامل ہیں)

امیر: یار مرزا! لگتا ہے تم کلکتہ والی کے زیادہ ہی دیوانے ہو گئے۔

مرزا خاں: کم بخت نے ایسا جادو کیا کہ جب سے گئی ہے، طبیعت بے چین رہتی ہے۔ لگتا ہے اس عمر کا عشق زیادہ ہی دل کو پریشان کرتا ہے۔

جلال کیوں مرزا صاحب! آپ تو کہا کرتے تھے

کیا ملے گا کوئی حسین نہ کہیں
جی بہل جائے گا کہیں نہ کہیں

مرزا خاں: ارے ہم نے تو یہ بھی کہا تھا۔

کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو
خوب رویوں سے جہاں خالی نہیں

امیر مرزا صاحب! الحمد اللہ گھر پر آپ کی بیگم موجود ہیں۔ ان سے عشق کیجیے۔ عاقبت بھی سدھر جائے گی۔

مرزا خاں: مولانا عاقبت کی فکر آپ کیجیے۔ بیگم سے عشق کر کے آپ جیسی شاعری ہوگی۔ ہم تو اس بات کے قائل ہیں:

اے فلک چاہیے جی بھر کے نظارا ہم کو
جا کے آنا نہیں دنیا میں دوبارا ہم کو

جلال. جی ہاں! آپ کی فطرت تو ہمیں معلوم ہے۔ آپ ہی نے کہا تھا:

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

مرزا خاں: جی ہاں! ہم تو ایسے ہی ہیں جلال صاحب!

جلال: تو کلکتہ کا سفر کیجیے۔

مرزا خاں ارادہ تو یہی ہے۔ ادھر سے پیغام بھی آ رہے ہیں۔ کہتے ہیں

رسم الفت نباہتے ہو اگر
جان کی خیر چاہتے ہو اگر

اٹھ کے سیدھے ادھر چلے آؤ

کوئی روکے مگر چلے آؤ

جلال: گویا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ پھر دیر کس بات کی ہے۔ سامان سفر باندھیے۔ اچھی قسمت پائی ہے جو حسینوں کا بلاوا آیا ہے۔ ورنہ ایسوں سے وفا کی امید کہاں ہوتی ہے۔

مرزا خاں: میاں! ہم روسیاہ سہی۔ بوڑھے سہی۔ لیکن ہم میں کچھ ایسی بات ہے جو کوئی انکار نہیں کرتا۔

ہر رنگ میں اب داغؔ سا ہم رنگ کہاں ہے

بوڑھوں میں وہ بوڑھا ہے، جوانوں میں جواں ہے

جلال: تو کب ارادہ ہے؟

مرزا خاں: بہت جلد انشاء اللہ

منظر۔۱۸

(مرزا خاں داغ اورنواب حسن علی خاں کی گفتگو جاری ہے)

حسن علی: معاف کیجیے گا حضرت! آپ نے بھی زندگی کا بہت ہی حسین انداز میں لطف اٹھایا بلکہ آج بھی وہ شوق باقی ہیں۔

مرزا خاں. جی! صحیح فرماتے ہیں۔ میں نے زندگی بھر اپنی محرومیوں سے انتقام لیا۔ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک نواب کی ناجائز اولاد۔ وراثت کا حقدار نہیں۔ کتنے باپ ملے۔ لیکن کسی کا وارث نہیں۔ زندگی میں جو تاریکی تھی، پروردگار نے وہ سیاہی چہرے پر بھی انڈیل دی۔ نواب صاحب کوئی غیرت مند آدمی ہوتا تو کہیں سے کود کر اپنی جان دے

دیتا۔ لیکن میں نے ہار نہیں مانی۔ اپنا مقام خود پیدا کیا۔

حسن علی: بے شک! آج پورے ہندوستان میں آپ کی اور آپ کی شاعری کے قدرداں موجود ہیں۔

مرزا خاں: جی ہاں! اب کسی کو یاد نہیں۔ میں کون ہوں۔ کس خاندان سے ہوں۔ لیکن آج یہ بندۂ کمینہ جہان استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، بلبل ہندوستان، نواب فصیح الملک مرزا خاں داغ کہلاتا ہے۔

(طنزیہ قہقہہ لگاتے ہوئے)

نواب صاحب خود کو فراموش کرنے کے لیے میں نے شاعری اور حسن کا سہارا لیا۔ شاعری نے میری داغدار زندگی کو بے داغ کر دیا اور حسیناؤں کی صحبت نے میرے احساس محرومی کو ختم کیا۔ کبھی منّی بائی، کبھی زہرا بائی، کبھی کبرا بیگم، کبھی صاحب جان، کبھی اختر جان، کبھی لطیف جان کس کس کے نام لوں۔

حسن علی: میں جانتا ہوں حضرت! آپ کے قدرداں ہر گوشے میں ہیں۔ لیکن منّی بائی حجاب سے وابستگی کو زیادہ شہرت ملی۔

مرزا خاں: ہاں صاحب آپ بھی مزہ لیجیے۔ آپ نے دیکھا نہیں کس طرح وہ سنگدل اس حالت میں چھوڑ کر چلی گئی۔ ہم نے اس کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ اس سے ملنے کلکتے پہنچے اور اس رشتہ کو آج تک نبھایا۔

لیکن کم بخت نے دیکھ لیا کہ اس کا وقت آخر ہے۔ چلی گئی۔

حسن علی: حضرت اسی سے تو یہ ڈیرے دار کہلاتی ہیں۔ جہاں خوشحالی دیکھتی ہیں، وہیں ڈیرہ ڈال دیتی ہیں۔

مرزا خاں: صحیح فرماتے ہیں- ان سے وفا کی امید ہی ناسمجھی ہے۔نواب صاحب ہمیں حیدرآباد میں بہت عزت و مرتبہ ملا۔آپ جیسے مخلص ملے۔ لیکن دلّی یاد آتی ہے۔ دلّی کے گلی کوچے ہم نہیں بھول پاتے۔ کیا کیا محفلیں تھیں۔ استاد ذوق، مرزا غالب، حکیم

مومن، آزردہ، شیفتہ کیا کیا لوگ تھے۔ ان فرنگیوں نے سب تباہ کردیا۔ ہندوستان کی تہذیب کو لوٹ لیا۔

حسن علی: حضرت آہستہ بولیے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ہندوستان پر اب فرنگیوں کی حکومت ہے۔

مرزا خاں مجھے اب کوئی خوف نہیں۔ میں بہت جلد اس قید سے آزاد ہونے والا ہوں۔ بہت جلد غلامی کی ان بیڑیوں سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ یہ کالا داغ گوروں سے دور چلا جائے گا۔

(بوڑھے مرزا خاں کا سانس پھولنے سا لگا تھا۔نواب حسن علی خاں نے شربت کا گلاس آگے بڑھایا۔مرزا خاں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن فالج کی وجہ سے اٹھنا مشکل ہوا۔اسی وقت خدمتگار جمال اندر آکر خبر دیتا ہے)

جمال حضور! اختر جان غزل سرائی کے لیے تیار ہو چکی ہیں اور اجازت چاہتی ہیں۔

مرزا خاں: ان سے کہو کہ ہم منتظر ہیں۔

(جمال اندر واپس چلا جاتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں اختر جان اٹھلاتی، بل کھاتی، ناز و غمز کے تیر چلاتی دیوان خانہ میں داخل ہو کر تسلیم بجالاتی ہے۔ اسے دیکھ کر مرزا خاں مسکراتے ہیں)

مرزا خاں: کہو اختری! لگتا ہے تم بھی اب ہماری صحبت سے بیزار ہو گئیں۔ بہت جلد تمہیں ہم سے نجات ملے گی۔

اختر جان: یہ آپ کی خام خیالی ہے حضور۔ بندی تو آپ کے احسانات سے زیر بار ہے۔

مرزا خاں: یہ ہماری دلجوئی کے لیے کہہ رہی ہو۔ ورنہ اس فالج زدہ بیمار کو سب چھوڑ کر چلے گئے۔

اختر جان: اللہ نہ کرے۔ بیمار ہوں آپ کے دشمن۔ بندی تو آپ کے دروازے سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

مرزا خاں: جی! باتیں بنانی تم سے خوب آتی ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں۔

حسن علی: مرزا صاحب! باتوں ہی میں وقت ضائع کریں گے۔ یا کچھ سنوائیں گے بھی۔ ایسا نہ ہو کہ اختر جان کا ارادہ بدل جائے۔

مرزا خاں: ہاں یہ تو ہے۔ ان کے ناز اٹھائے بغیر تو ممکن ہی نہیں کہ محفل

گرمائے۔اختری آج استاد کی وہ غزل سناؤ

لائی حیات، آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے ، نہ اپنی خوشی چلے

ہم نے تو کبھی اس طرح کی غزل کہی نہیں۔

اختر جان: جو حکم!

(نواب مرزا خاں داغ یہ کہہ کر گاؤ تکیہ پر دراز ہو جاتے ہیں۔ دائیں جانب نواب حسن علی خاں دو زانو بیٹھے ہیں۔ بائیں طرف لطیف جان گلوری بنا رہی ہیں۔ جمال حقہ تازہ کر کے ایک جانب بیٹھ جاتا ہے۔اختر جان غزل چھیڑتی ہے)

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

ہو عمر خضر بھی، تو ہو معلوم وقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے ابھی چلے

ہم سے بھی اس بساط پہ کم ہوں گے، بد قمار
جو چال ہم چلے وہ نہایت بُری چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے

پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی لگے

نازاں نہ ہوں خرد پہ، جو ہونا ہے ہو وہی
دانش تری، نہ کچھ مری، دانش وری چلے

(پورا ماحول سنجیدہ ہے۔ مرزا خاں آنکھیں بند کیے محظوظ ہو رہے ہیں۔ اختر جان مطلع دہرا کر ختم کرتی ہے۔ مرزا خاں داغ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہیں اور بہت دھیمی ڈوبتی آواز میں مطلع دہراتے ہیں)

مرزا خاں: نواب حسن علی خاں صاحب استاد نے شاید یہ غزل ہمارے ہی لئے کہی تھی۔ کیا خوب مطلع ہے:

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

('اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے' دہراتے ہوئے آہستہ آہستہ مرزا خاں کا سر تکیہ سے جا لگتا ہے۔ لطیف جان مرزا خان کی یہ حالت دیکھ چیختی ہے۔)

لطیف جان: نواب صاحب – ہائے نواب صاحب

(سب مرزا خاں داغ کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ پس منظر میں یہ غزل چل رہی ہے۔)

عذر آنے میں بھی ہے، اور بلاتے بھی نہیں

باعث ترک ملاقات بتاتے بھی نہیں

☆☆☆

خواب

کردار:

افتخار حسین : عمر تقریباً ۵۵ سال

امراؤ بیگم : عمر تقریباً ۵۰ سال

نور محل : افتخار حسین کی نوجوان بیٹی

زرینہ بیگم : ۶۰ سالہ خاتون

بلقیس جہاں : ۴۰ سالہ خاتون

نجمہ : نوجوان لڑکی

ڈاکٹر

سپاہی

پہلا منظر

(امراؤ بیگم، بلقیس جہاں اور زرینہ بیگم آپس میں گفتگو کر رہی ہیں)

امراؤ بیگم کیوں زرینہ آپا ابھی عشرت علی کی بیٹی کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

زرینہ بیگم: ارے کہاں پتہ چلا، ایک مہینہ سے پندرہ دن اوپر ہو گئے۔

بلقیس جہاں: (پان چباتے ہوئے) اے بی بی کل جمراتی سقّے کی بیوی کہہ رہی تھی کہ اس لونڈیا ہی میں کچھ عیب تھا، کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔

امراؤ: اللہ بہتر جانے، پیٹ کی داڑھی کس نے دیکھی ہے۔ ویسے وہ لڑکی ایسی نہ تھی، اللہ رکھے عشرت علی کا گھرانہ تو بڑا دین دار ہے اور لڑکیاں تو بے پردہ باہر بھی نہیں نکلتیں۔

زرینہ بیگم: اللہ ہر مصیبت سے محفوظ رکھے، جس کمبخت نے بھی لونڈیا کو غائب کیا، بڑا برا کیا۔ بے چاری کی ماں تو روتے روتے آنکھیں پھوڑے لے رہی ہے۔

بلقیس جہاں: (سرد آہ بھرتے ہوئے) ہاں بہن جوان لڑکی کا غائب ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آئے دن خبریں آتی ہیں کہ فلاں جگہ سے غنڈے لڑکی کو لے گئے، فلاں جگہ ایک لڑکی مردہ ملی۔ یہ تو اب روز روز کی خبریں ہیں۔ آجکل تو عزت بچانا مشکل ہو گیا ہے، پتہ نہیں دنیا کا کیا حال ہونے والا ہے۔

امراؤ بیگم: ویسے میں تو کہتی ہوں کہ اگر وہ لڑکی اب نہ ملے تو اچھا ہے۔ نہ ملے گی تو کچھ رو دھو کر صبر تو کر لیا جائے گا۔ آخر مرنے کا بھی تو صبر آجاتا ہے، لیکن اگر مل گئی تو عمر بھر کون روئے گا۔ کون اپنے گھر میں اُسے بہو بنا کر لے جائے گا۔

بلقیس. ہاں یہ بات تو ہے۔ اب کون آنکھوں دیکھے اسے قبول کرے گا۔

زرینہ بیگم ارے امراؤ! نور محل کی طبیعت اب کیسی ہے — سنا ہے کوئی ایسا ویسا خواب دیکھ کر ڈر گئی ہے۔

امراؤ بیگم: (آواز میں درد) کیا بتاؤں آپا — نور کی وجہ سے اور سب پریشان ہیں۔ پچھلے جمعہ کی بات ہے، رات کو سوتے سوتے چیخ پڑی اور اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی، زور زور سے رونے لگے، میں نے سمجھا کہ

شاید کوئی برا خواب دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ لاکھ پوچھا لیکن اس نے کچھ بتا کر ہی نہ دیا — دوسری رات کو پھر اسی طرح چیخی اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

زرینہ بیگم: یہ تو بڑی فکر کی بات ہے۔

امراؤ: ہاں آپا نہ جانے کیوں مجھے بھی ڈر سا لگنے لگا ہے۔ اور اب تو اس بے چاری کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ ہر چیز سے ڈرنے لگی ہے۔ پہلے ہی اتنا کسی کے گھر نہ جاتی تھی، اب تو بالکل نکلنا ہی بند کر دیا ہے۔ کوئی گھر میں آتا ہے تو سہم کر اندر بھاگ جاتی ہے۔ ہر ایک کو سہمی نظروں سے دیکھتی ہے۔

بلقیس: یہ نہیں بتاتی کہ خواب میں کیا دیکھا؟

امراؤ بیگم: یہی تو مشکل ہے — خواب سے جب چیختی ہوئی بیدار ہوتی ہے تو صرف نہیں نہیں! اُس کی زبان سے نکلتا ہے۔ جیسے اس پر کوئی جبر کر رہا ہو اور وہ انکار میں چیختی ہو۔

بلقیس جہاں: کسی کو دکھانا چاہئے۔

امراؤ بیگم: ڈاکٹر کو دکھایا تھا، اس نے کہا کہ خواب میں اتنا ڈر گئی ہے کہ اس کے دماغ پر اثر ہوگیا ہے۔ اُس نے دوائیں بھی دیں لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔

زرینہ بیگم میری رائے ہے کسی بزرگ کو دکھاؤ، یہ معاملہ ڈاکٹروں کا نہیں۔ ضرور کسی بری روح کا سایہ اُس پر پڑ گیا ہے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی دشمن نے کچھ کرادیا ہو۔

امراؤ بیگم: وہ بھی سب کر کے دیکھ لیا۔تعویذ بھی باندھ رکھا ہے، لیکن کوئی فائدہ تو دکھائی دے نہیں رہا خدا جانے کیا بلا میری بچی کے سر پڑ گئی ہے۔

(امراؤ بیگم کی بات پوری ہوتے ہی افتخار حسین کے کھنکھارنے کے ساتھ یہ آواز آتی ہے)

افتخار حسین: (آواز میں سنجیدگی اور بزرگی) ارے بھئی ہم بھی اندر آجائیں۔

بلقیس جہاں: آجایئے بھائی صاحب کوئی غیر نہیں ہے۔

افتخار حسین: السلام علیکم — اوہو — آپا زرینہ بھی ہیں۔آج کیسے غریب خانہ کا راستہ بھول گئیں اور بھئی بلقیس تم کیسی ہو؟ بچوں کے رزلٹ وغیرہ آگئے۔

بلقیس جہاں: ہاں بھائی صاحب! اللہ کا شکر ہے، سب بچے اچھے نمبروں سے پاس ہوگئے۔ عارف کے ابو آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔

افتخار حسین: ہاں بھئی آئیں گے کسی دن — ہم تو آج کل کچھ ایسی پریشانی میں پھنس گئے ہیں کہ بتا نہیں سکتے — ہاں بھئی نور کہاں ہے؟

امراؤ بیگم: اپنے کمرے میں ہے۔

افتخار حسین: اُس نے کچھ بتایا نہیں۔

امراؤ بیگم: کچھ کہتی ہی نہیں۔ اپنے کمرے کی کھڑکیوں کو پہلے ہی بند کرلیا تھا۔ آج

تو دروازہ بھی بند کرلیا ہے۔ میں نے منع کیا تو کہنے لگی، مجھے ڈر لگتا ہے۔

افتخار حسین: اُسے اس طرح اکیلا نہ چھوڑا کرو۔ اُسے اپنے ساتھ رکھا کرو۔ اب تو مجھے بھی اُس کے نامعلوم خواب سے ڈر لگنے لگا ہے۔ خدانخواستہ......

(افتخار حسین اتنا کہہ کر رک جاتے ہیں اور پھر اس طرح بات شروع کرتے ہیں)

افتخار حسین: ارے ہاں — وہ عشرت علی کی لڑکی نجمہ جو گم ہوگئی تھی، سنا ہے کہ رنڈیوں کے بازار میں ہے، کوئی پندرہ روز قبل دو ہزار روپے میں فروخت کر گیا تھا، لیکن ابھی صحیح پتہ نہیں چلا ہے۔ لوگ وہاں دیکھنے گئے ہیں، لیکن اب مل بھی جائے تو کیا فائدہ؟

بلقیس جہاں: ہاں بھائی صاحب اُس بے چاری کی تو زندگی تباہ ہوگئی۔

زرینہ بیگم: لیکن اس کو غائب ہوئے تو ڈیڑھ مہینہ ہوگیا۔ ایک مہینہ پتہ نہیں کہاں کہاں رہی ہوگی۔

(زرینہ بیگم کا جملہ ختم ہوتے ہی نور محل کے چیخنے کی آواز آتی ہے — ''بچاؤ — بچاؤ'' — وہ سب چونکتے ہیں — ''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟''

(چیخ و پکار کے بیچ دروازہ پیٹنے کی آواز — افتخار حسین کی گھبرائی ہوئی تیز آواز) "ارے بچی کو کیا ہوا" امراؤ بیگم کی آواز کی آوازیں۔

افتخار حسین: کھولو بیٹی — دروازہ کھولو — کیا ہوا — جلدی کھولو۔

(چند لمحوں کے بعد دروازے کے پٹوں کی دیوار سے ٹکرانے کی آواز)

امراؤ بیگم (چلاتے ہوئے) ارے میری بچی کو کیا ہوگیا — ارے اس کے تو سارے کپڑوں میں آگ لگ گئی — ارے کچھ کرو — ارے کوئی پانی ڈالو اس پر — میری بچی کیسی تڑپ رہی ہے —۔

بلقیس جہاں: پانی مت ڈالیے گا بھائی صاحب — اس کے اوپر کمبل ڈال دیجیے۔

امراؤ بیگم: (گھبراہٹ) ارے جلدی کرو چاروں طرف سے لپیٹ دو۔

(چند لمحوں کے بعد نور محل کے چیخنے کی آواز آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے

اور سسکیوں کی آواز رہ جاتی ہے)۔

بلقیس: خدا نے خیر کر دی جو وقت پر پتہ چل گیا۔ اب اِسے فوراً اسپتال لے جایئے۔

افتخار حسین: ہاں — نور کی ماں تم بھی ساتھ چلو۔

دوسرا منظر

(اسپتال میں ایک بستر پر نورمحل لیٹی ہے۔ ڈاکٹر موجود ہے)

افتخار حسین:　ڈاکٹر صاحب کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے۔

ڈاکٹر:　آپ اطمینان رکھئے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ لوگوں نے بڑی سمجھداری سے کام لیا جو فوراً کمبل میں لپیٹ دیا　خدانے چاہا تو جلد ہی زخم اچھے ہوجائیں گے۔

(منظر کے بدلنے کے لئے موسیقی)

امراؤ بیگم:　آج تیسرا دن ہوگیا۔ یہ لوگ کب چھٹی کریں گے۔

افتخار حسین　شاید کل کردیں۔ اب تو کافی آرام ہے　پہلی جیسی بے چینی بھی اب نہیں ہے۔

امراؤ بیگم:　ہاں آج تو کافی جلدی سوگئی — اب آپ بھی آرام کریجئے، رات کافی ہوگئی ہے۔

افتخار حسین:　تم بھی اس کے پاس ہی لیٹ جاؤ　یہ لائٹ آف کردو۔

(تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد نورمحل کے چیخنے کی آواز پھر آتی ہے)

نورمحل:　نہیں — نہیں —۔

افتخار حسین:　(گھبراہٹ) کیا ہوا بیٹی — کیا بات ہے — تم نے کیا دیکھا — کون تھا؟

نورمحل:　(گمبھیر آواز — ٹھہر ٹھہر کر) وہ سب کتنے ڈراؤنے ہیں — نہیں — وہ میں نہیں —۔

افتخار حسین.　کون ہے بیٹی　کہاں ہے　ہاں بتاؤ　تم نے کیا دیکھا؟

امراؤ بیگم:　ہاں بیٹی بتاؤ　تم نے کیا خواب دیکھا؟

نورمحل　(دھیمے لہجے میں) مسلسل کئی راتوں سے میں ایک ہی خواب دیکھ رہی ہوں۔ ایک وسیع میدان ہے اور نجمہ بے یار و مددگار اُس میدان کے بیچ کھڑی ہے۔ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہے۔ چاروں سمتوں کو آس بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔ ایک سمت چند اوباش نوجوان ہاتھوں میں چاقو لئے اُس کی طرف آتے ہیں، نجمہ ڈر جاتی

ہے اور منت کرتی ہے۔ وہ سب قہقہے لگاتے ہیں۔

(قہقہوں کی آواز — نجمہ کی آواز)

نجمہ: نہیں — مجھے مت چھوڑو — مجھے چھوڑ دو — مجھے جانے دو۔

(قہقہوں اور نجمہ کی آواز کے بعد نور محل کی آواز پھر اُبھرتی ہے)

نور محل: وہ بھاگنا چاہتی ہے لیکن بھاگ نہیں پاتی۔ وہ آوارہ نوجوان اس کی چیخوں کو اپنے قہقہوں کی تہوں میں دباتے ہوئے اُس کے جسم کے کپڑے تار تار کر کے اُسے برہنہ کر دیتے ہیں اور اپنے ناپاک ارادوں کو پورا کر کے اُسے اسی میدان میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد نجمہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ اُس کے جسم پر کپڑے آجاتے ہیں اور وہ پناہ کی آس میں دوسری سمت نگاہیں دوڑاتی ہے۔ اُسے چند سپاہی اس سمت سے آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر خوشی کی لہر اس کے جسم میں دوڑ جاتی ہے کہ اب وہ ضرور محفوظ جگہ پر پہنچ جائے گی۔ وہ سپاہیوں سے التجا کرتی ہے۔

(نجمہ اور سپاہیوں کی آواز)

نجمہ: مجھے میرے گھر پہنچا دیجیے — میں بہت پریشان ہوں — بالکل تنہا ہوں۔

(سپاہی ہنسنے لگتے ہیں)

ایک سپاہی: ارے آدمی تو جہاں چاہے اس کا گھر بن سکتا ہے۔ ہم تمہارا گھر بساتے ہیں۔

دوسرا سپاہی: ہم تمہاری پریشانی دور کرتے ہیں۔

تیسرا سپاہی: اور ہم تمہاری تنہائی دور کرتے ہیں۔

(سپاہیوں کے زور سے قہقہہ لگانے کی آواز نجمہ کی منّت)

نجمہ: نہیں— نہیں— مجھے چھوڑ دیجئے— مجھے چھوڑ دیجئے۔

(یہ آوازیں دب جاتی ہیں اور پھر نور محل کی آواز ابھرتی ہے)

نور محل: اور وہ عوام کے محافظ اپنے گندے ارادوں کو پورا کر کے اسی سمت کو لوٹ جاتے ہیں۔ نجمہ کچھ دیر کے بعد پھر کھڑی ہوتی ہے اور اُس کا جسم پھر کپڑوں سے ڈھک جاتا ہے۔ اس بار وہ تیسری سمت نظر یاس سے دیکھتی ہے — ایک معزز آدمی کی سواری آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جیسے کوئی حاکم ہو ایک بار پھر خوشی اُس کے دل میں اُمڈ آتی ہے، وہ شخص نجمہ کے قریب آ کر رُک جاتا ہے اور ایک قیمتی شال اُس کی طرف پھینکتا ہے، جیسے اُس کی مدد کر رہا ہو، لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس شال کا معاوضہ وصول کرنے کے لئے نجمہ کے بدن سے کپڑے اتار دیتا ہے۔ جب وہ معزز آدمی لوٹتا ہے تو نجمہ اسی میدان میں پڑی رہ جاتی ہے۔ چند ساعت کے بعد وہ پھر اٹھتی ہے۔ پھر اُس کا برہنہ جسم کپڑوں میں چھپ جاتا ہے اور

اب وہ چوتھی سمت حسرت کی نظر دوڑاتی ہے کہ یہ آخری سمت ہے اور اُس سمت سے ایک بزرگ کو آتے ہوئے دیکھ کر اپنی بچی ہوئی خوش ہونے کی قوت سے خوش ہوتی ہے۔ اُس بزرگ کے چہرے پر ریش دراز تھی، جسم پر زرد لباس تھا۔ گلے میں بڑی بڑی تسبیحیں پڑی تھیں، ہاتھ میں چمٹا بجاتا ہوا اس کے قریب آیا۔ نجمہ نے اس کے قدموں میں سر رکھ دیا اور مدد کی بھیک مانگی۔

(نجمہ کی آواز)

نجمہ: بابا میری مدد کرو — مجھے آسرا دو — مجھے میرے گھر پہنچادو۔

(نورمحل کی آواز پھر آتی ہے)

نورمحل: اور اُس درویش شکل آدمی نے بھیک کے بدلے اُس کے جسم کے کپڑے اتار لیے۔ نجمہ پھر اس میدان میں تنہا برہنہ پڑی رہ گئی۔ وہ درویش جاچکا تھا۔ اِس بار وہ اُٹھ نہیں سکی اُس کے جسم پر کپڑے نہیں آئے، وہ بے حس وحرکت پڑی تھی۔ آہستہ آہستہ میں اُس کے قریب پہنچی اور جب میں نے اُسے دیکھا تو میں چونک پڑی — وہ نجمہ نہیں تھی — وہ — وہ میں تھی — میرا جسم برہنہ پڑا تھا — وہ لہولہان جسم میرا تھا۔"

(اپنی بات ختم کرنے کے بعد نورمحل کے رونے کی آواز آنے لگتی

ہے۔افتخار حسین بہت دھیمی آواز میں بڑبڑاتے ہیں)

افتخار حسین: تقسیم ملک کے وقت حافظ ابراہیم کی نواسی اور پنڈت ہری پرساد کی بیٹی نے بھی ایسے ہی خواب دیکھے تھے اور خودکشی کرلی تھی — اے خدا میری بچی کی حفاظت کر——

ایک بادشاہ کی کہانی

کردار:

شہنشاہ ایران

ملکہ فرح

ملکہ ثریا

شاہ پور

سپاہی

کچھ آوازیں

پہلا منظر

(ایک کمرے میں نیچے بچھے ہوئے قالین پر معزول شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی اور ملکہ فرح دیبا بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کے پاس جام و صراحی رکھے ہیں۔ شہنشاہ کے ہاتھ میں ایک خالی جام ہے اور وہ اس خالی جام پر نظریں نکائے ہوئے محو خیال ہیں۔ ان کے دائیں جانب فرح دیبا خاموش بیٹھی ہیں۔ ان کا داہنا ہاتھ صراحی کے دستہ پر ہے اور وہ بادہ ناب صراحی کو گھور رہی ہیں۔ اچانک ایک نقیب کی آواز آتی ہے۔)

نقیب: عالی جناب عزت مآب شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی جلوہ افروز ہورہے ہیں۔ باادب — ہوشیار —

(شہنشاہ ایک دم چونکتے ہیں اور تیزی سے ہاتھ اٹھا کر خالی جام کو دیوار پر مارتے ہیں۔ وہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے)۔

شہنشاہ: (چیختے ہوئے) نہیں! نہیں! ہم شہنشاہ نہیں ہیں۔ بند کرو یہ بیہودہ گوئی۔

(ملکہ حیرت سے شہنشاہ کو دیکھتی ہے)

ملکہ: کیا ہوا؟ کیسی بے ہودہ گوئی؟

شہنشاہ: (دھیمے لہجہ میں) تم نے نقیب کی آواز نہیں سنی؟

ملکہ: کون نقیب؟ کیسی آواز؟

شہنشاہ: جو ہماری آمد کی اطلاع کررہا تھا۔

ملکہ: یہاں تو کوئی بھی نہیں یہ آپ کا وہم ہے صرف۔

شہنشاہ: یقیناً یہ ہمارا وہم ہے — لاؤ ملکہ اس جام کو زہر ہلاہل سے لبریز کردو۔ اب ہماری جینے کی خواہش ختم سی ہوگئی ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارا رشتۂ حیات کس اُمید پر ابھی تک قائم ہے۔ ہم تو اسی وقت مر چکے جس وقت ہم اپنے وطن عزیز سے رخصت ہوئے تھے — لاؤ ملکہ توقف نہ کرو۔ محل کی ان گونجتی ہوئی آوازوں نے ہمیں بدتر مقام پر

پہنچا دیا ہے۔

ملکہ: خدا نہ کرے آپ کے دشمنوں کو کچھ ہو۔

شہنشاہ: ہمارے دشمنوں کے مصائب تو ختم ہو چکے ہیں، وہ تو شاد ہیں لیکن ہم تاریک غار میں دہکتے ہوئے انگاروں پر چل رہے ہیں۔ ہمارے بدن میں اتنی تاب نہیں کہ ان کی تپش کو برداشت کر سکیں۔

ملکہ: ایسا نہ کہئے عالی جاہ۔ آپ شہنشاہ ہیں اور شہنشاہوں کو بزدلی کے کلمات زیب نہیں دیتے۔

شہنشاہ: شہنشاہ کہہ کر ہمارا مذاق نہ اڑاؤ — شہنشاہ مر چکا ہے۔

ملکہ: شہنشاہ مرا نہیں کرتے۔ کل جب مورخ ایران کی تاریخ قلم بند کرے گا تو آپ کو شہنشاہ ایران ہی کے نام سے یاد کرے گا۔

شہنشاہ: اور آپ کو ملکۂ ایران۔

(شہنشاہ کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھرتی ہے۔ ملکہ جھینپ سی جاتی ہے۔ شہنشاہ دوسرا جام اٹھاتے ہیں)

شہنشاہ: اسے لبریز کر دو۔

ملکہ: خدا کے لئے آپ اس سے گریز کیجئے۔

شہنشاہ: نہیں — ہمیں اس سے نہ روکو۔ آپ کا خلوص آپ کی محبت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ آپ اپنے ہاتھوں سے ہمارے لئے زہر کا

جام

بھر سکیں، لیکن ہمیں شراب سے نہ روکیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ عالم بے خودی میں ہم اپنے آپ کو فراموش کر سکیں۔

ملکہ: لیکن اس طرح آپ ماضی کو نہیں بھلا سکیں گے۔ ہمت سے کام لیجیے۔ ہمارے پاس اب بھی دولت کی کمی تو نہیں۔

شہنشاہ: لیکن اس دولت کی کیا حقیقت ہے — اس تاجر کے پاس ہم سے زیادہ مال و زر ہوگا جس کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ ہمارا اقتدار — ہمارا منصب ہماری دولت تھی، جو ہم سے چھین لی گئی۔

ملکہ: اتنے مایوس نہ ہوئیے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اب سے پہلے ان گنت بادشاہوں کے سروں سے تاج چھینے جا چکے ہیں۔ کیا ہندوستان جیسے وسیع ملک پر حکومت کرنے والے مغلوں کے آخری شہنشاہ کی حالت ہم سے بہتر تھی؟ انھیں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ تمام آرائشیں چھین لی گئی تھیں۔ ہم تو آزاد ہیں۔

شہنشاہ: لیکن قیدیوں سے بھی بدتر۔

ملکہ: وہ کیسے —؟

شہنشاہ: یہ آپ خود بھی جانتی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ موت کے بے رحم ہاتھ ہر لمحہ ہمارے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔ آج اگر ہم کسی طرح وطن پہنچ جائیں تو ہمیں اسی طرح گولی ماردی جائے گی جس

طرح ہمارے دربار سے وابستہ لوگوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ کیا آپ نہیں جانتیں اس مقام پر بھی قاتل ہمیں اپنی بندوق کا نشانہ بنانے کے لئے موقع کی تلاش میں ہیں — ہمیں زندہ یا مردہ حالت میں گرفتار کرنے کے لئے ہمارے دشمنوں نے لاکھوں روپے کے انعام کا اعلان کیا ہے۔

ملکہ: لیکن ان کا یہاں تک پہنچنا ناممکن ہے۔ کوٹھی کے چاروں طرف زبردست پہرہ لگا ہوا ہے۔

شہنشاہ: آستینوں میں بھی سانپ پرورش پاتے ہیں بیگم — کون جانے انھیں میں سے کسی کے دل میں دولت کا لالچ پیدا ہو جائے۔

ملکہ: آپ صحیح فرماتے ہیں، لیکن اس کی توقع کم ہے۔

(کچھ وقفہ کے بعد)

شہنشاہ: کیوں ملکہ آپ کو بھی تو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ اگر آپ ہمیں قتل کر دیں تو انعام کے ساتھ ساتھ ملک میں آپ کو شاہانہ استقبال دیا جائے گا۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں تا کہ ہم اس اذیت دائمی سے نجات پا جائیں اور آپ کو بھی اس قفس کی زندگی سے رہائی حاصل ہو۔

ملکہ: کیا آپ کو ہماری محبت پر شک گزرا؟

شہنشاہ: نہیں! نہیں! بخدا ہم نے اس خیال سے یہ نہیں کہا تھا۔ خدا کے واسطے آپ اپنے دل پر کسی طرح کا غبار نہ لایئے گا۔ آپ کی محبت اور آپ کی موجودگی نے ہی تو ہماری زندگی کی ویرانیوں کو دور کیا ہے۔

ملکہ: یقیناً، آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ کہیں فرح آپ کو قتل نہ کردے۔

شہنشاہ: بخدا فرح ہم نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔ آج کل ہمارے ہوش وحواس منتشر ہوگئے ہیں، آپ ہماری کسی بات کا احساس نہ لیجیے گا ورنہ ہماری زندگی کے بقیہ دن موت میں تبدیل ہو جائیں گے۔

ملکہ: نہیں! ہمیں آپ کی کوئی بات ناگوار نہیں گزری۔ ہماری نگاہ میں محبت دولت سے بہت درجے بلند ہے اور وہ سب سے بڑا بدقسمت ہے جو دولت کو حاصل کرنے کے لئے محبت کو شہید کردے۔

شہنشاہ: ہاں فرح! ہم اپنی دولت انھیں دے سکتے ہیں، اگر وہ ہمیں اپنے بچوں کے ساتھ ایک عام آدمی کی زندگی گزارنے دیں۔

ملکہ: کاش ایسا ہوسکتا——۔

(ملکہ اٹھ کر اندر جاتی ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں شہنشاہ صراحی اٹھا لیتے ہیں اور اس کی سب شراب پی جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ملکہ واپس آتی ہے۔ شہنشاہ کے پاس خالی صراحی دیکھ کر حیرت کا

اظہار کرتی ہے)۔

ملکہ: یہ آپ نے کیا کیا؟ صراحی کی ساری شراب آپ نے ختم کردی۔ یا خدا بیک وقت اتنی شراب — آپ کیوں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں؟ اس سے بہتر ہے کہ ہم لوگوں کو زہر دے دیجئے تاکہ ہم یہ سب نہ دیکھ سکیں۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

شہنشاہ: ہم اپنی شرمندگی کو دور کرنا چاہتے ہیں؟

ملکہ: کیسی شرمندگی؟

شہنشاہ: ہم اپنے آپ سے شرمندہ ہیں۔ تم سے شرمندہ ہیں۔ اپنے ولی عہد سے شرمندہ ہیں۔ اور یہ شرمندگی ہمارا جینا دشوار کر رہی ہے۔

ملکہ: لیکن آپ کے شرمندہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس میں آپ تو قصوروار نہیں۔

شہنشاہ: ہم ہی قصوروار ہیں۔ کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہوگا کہ تاج زرنگار آپ کے سر سے نوچ لیا جائے گا۔ ولی عہد کے سامنے ہم کبھی نظریں نہیں اٹھا سکیں گے۔ اس نے بھی شہنشاہ ہونے کا خواب دیکھا ہوگا، لیکن اب وہ خواب مثل سراب بھی نہیں۔

ملکہ: بہت کم خواب سچے ہوا کرتے ہیں۔

شہنشاہ: لیکن قبل از وقت خواب کے ٹوٹ جانے سے بہت شدید دکھ ہوتا ہے۔

ملکہ: خواب ادھورا ہو یا مکمل خواب محض خواب ہے۔

شہنشاہ: آپ صرف ہماری تشفی کی خاطر ایسا کہہ رہی ہیں ورنہ خود آپ بھی اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔

(ملکہ ذرا دیر کو سر جھکا لیتی ہے۔ شہنشاہ پر شراب اثر دکھاتی ہے اور وہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قدموں میں لرزش پیدا ہوتی ہے۔ ملکہ انھیں سنبھالنے کے لئے بڑھتی ہے)

ملکہ: آپ آرام کیجئے۔

شہنشاہ: نہیں ملکہ، ہمارا آرام تو ہم سے رخصت ہو چکا ہے۔ (نشہ کی آواز میں) آپ جا کر آرام کیجئے — ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجئے — کیا آپ جانتی ہیں، یہ آوازیں کیسی ہیں؟

ملکہ: کیسی آوازیں! ہمیں تو کوئی آواز نہیں آ رہی۔

شہنشاہ: غور سے سنو ہماری حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا جا رہا ہے۔

(اسی درمیان بہت ساری آوازیں آتی ہیں — انقلاب - زندہ باد، انقلاب - زندہ باد — تاناشاہی ختم کرو — انقلاب - زندہ باد)

یہ کون لوگ ہیں جو ہماری حکومت کو تاناشاہی کہہ رہے ہیں — کوئی ہے۔

ایک مرد کی آواز: یور ہائی نیس! ملک میں بغاوت زور پکڑ رہی ہے۔ باغیوں کا ایک

بہت بڑا جلوس محل کی طرف آرہا ہے۔

شہنشاہ: باغیوں کو ختم کردو — بغاوت حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کردیتی ہے۔ فوج کو حکم دو، سرزمین ایران پر ایک بھی باغی زندہ نہ رہنے پائے۔

(گولیوں اور ٹینکوں کی آوازیں — آدمیوں کی دردناک چیخیں)

شہنشاہ: باغیوں کی یہی سزا ہے۔

(لڑائی کی آواز مسلسل آتی ہے)

ایک مرد کی آواز یور ہائی نیس! ہر شہر سے بغاوت ہونے کی خبریں آرہی ہیں۔ حالات بہت بگڑتے جارہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے ملک کا ہر فرد باغی ہوگیا ہے۔

شہنشاہ: مقابلہ جاری رکھو۔ آخر کب تک فوج سے مقابلہ کریں گے — شاہ پور کو حاضر کرو۔

(لڑائی کی آوازیں)

شاہ پور: یور ہائی نیس!

شہنشاہ: شاہ پور! ملک کے حالات بہت نازک رخ اختیار کرچکے ہیں۔ آپ کو ہم وزیراعظم مقرر کرتے ہیں۔ آپ حالات کو سنبھالیے۔

شاہ پور: یور ہائی نیس! باغیوں کو کچلا جارہا ہے، لیکن باغی بے شمار ہیں۔ میری رائے ہے کہ جب تک حالات معمول پر نہیں آجاتے، آپ ملک سے باہر

چلے جائیں۔

شہنشاہ: ہاں ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں — یہی بہتر رہے گا۔

(تھوڑا سا وقفہ — لڑائی کی آوازیں ختم ہو جاتی ہیں، صرف شاہ کی نشہ میں ڈوبی ہوئی آواز آتی ہے)

شہنشاہ: ہم اپنے ملک سے دور ہو گئے کیا وہاں ہم پھر جا سکیں گے۔ ہمارا قصور کیا تھا — کیوں ہمارے خلاف بغاوت ہوئی، ہم تو ملک کی ترقی چاہتے ہیں — ہم نے ایسا کیا گناہ کیا جس کی سزا ہمیں مل رہی ہے۔

ایک عورت: (گونجتی ہوئی آواز) تو نے میرے چار بیٹوں کو موت کی نیند سلا دیا، تو نے میری کوکھ سونی کر دی۔

دوسری عورت: تو نے مجھے یتیم کر دیا۔

تیسری عورت: تو نے میرے سہاگ کو لوٹ لیا۔

تینوں کی ملی جلی آواز: تو قاتل ہے تو قاتل ہے تو قاتل ہے۔

شہنشاہ (چیختے ہوئے) نہیں! نہیں! ہم نے کسی کا قتل نہیں کیا۔ ہم نے کسی کی کوکھ سونی نہیں کی — ہم نے کسی کو یتیم نہیں کیا — ہم نے کسی کا سہاگ نہیں لوٹا — یہ سب جھوٹ ہے — یہ سب جھوٹ ہے —۔

(شہنشاہ کی آواز تھم جاتی ہے —)

دوسرا منظر

(وہی کمرہ — شہنشاہ اور ملکہ باتیں کررہے ہیں)

شہنشاہ فرح! ہم نے ایران اس لئے چھوڑا تھا کہ وہاں کے لوگ امن اختیار کریں۔ خونریزی ختم ہو۔ اور اب جب کہ ہمیں حکومت سے برطرف کردیا گیا ہے، حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے، جنھوں نے ہمیں ظالم کے خطاب سے نوازا۔ لیکن آج کل جو روز نئے حکمراں لوگوں کو موت کی سزا دے رہے ہیں، یہ کیا ہے؟ کیا یہ ظلم نہیں؟ ہمارے سابق وزیراعظم جنرل ہویدا کو بھی گولی ماردی گئی۔ شاہ پور اپنی زندگی چھپائے پھر رہے ہیں۔

ملکہ: خدا بہتر جانے کہ ظلم کیا ہے اور انصاف کیا ہے؟ جانے دیجئے اس ذکر کو۔ خدا رحم کرے اس ملک پر۔

(تھوڑا سا وقفہ)

شہنشاہ: ہماری معزولی کے بعد ہمارے ولی عہد کی کیا رائے ہے؟

ملکہ: وہ تو بچہ ہے، ابھی اس کی کیا رائے ہوگی۔ وہ تو بس خاموش ہے۔

شہنشاہ: کیا آپ کو یاد ہے، ہمیں ولی عہد کے لئے کیا کیا کرنا پڑا—— ہم ایک عرصۂ دراز تک تاجِ شاہی سر پر نہیں رکھ سکے، کیونکہ ہمارا کوئی ولی عہد نہیں تھا جو اُس حکومت کو جواب ہم سے دور ہوگئی، ہمارے بعد سنبھال سکے۔ مصر کی حسین ترین شاہزادی اور ایران کی ملکہ فوزیہ کا کیا قصور تھا جو اُسے اپنے شوہر سے ہمیشہ کے لئے الگ کیا گیا۔ یہی کہ وہ ولی عہد کی ماں نہیں بن سکی۔ تم نہیں جانتی ہو ملکہ، وہ ہمیں کتنا عزیز رکھتی تھی۔ اُسے حکومت کے کاموں سے دلچسپی نہیں تھی، لیکن ہر لمحہ ہمارے دکھ درد میں شریک رہتی تھی۔

اور جس روز وہ ہم سے جدا ہوئی تھی، اُس رات اُس نے بہت دیر تک ہم سے باتیں کیں۔ وہ اس رات سو نہیں سکی۔ تمام رات ہمیں اس طرح دیکھتی رہی جیسے ہم اس سے بچھڑ جائیں گے — اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے اپنے وطن لوٹ

گئی۔ وہاں سے اُس نے ہمیں آخری بار لکھا تھا۔

فوزیہ کی آواز: مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو وہ خوشی نہ دے سکی، جس کا آپ کو انتظار ہے۔ کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا۔ شاید تقدیر نے ہمارا ساتھ اتنے ہی دنوں کا لکھا تھا۔ میں ہمیشہ کے لئے آپ کی زندگی سے دور چلی آئی۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ دوسری شادی کرلیں۔ خدا آپ کو ولی عہد کی دولت سے نوازے۔ شہناز کا خیال رکھئے گا۔ اسے ماں کی جدائی کا احساس نہ ہونے دیجئے گا ــــ خدا حافظ۔

شہنشاہ: اور اس طرح فوزیہ اور ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ وہ کتنی عالی ظرف تھی کہ ہماری خوشی کی خاطر اُس نے خود علیحدگی اختیار کرلی۔ اور ہم کتنے خودغرض تھے کہ ہم اُسے پھر بلا نہ سکے۔

(شہنشاہ جام کو بھرتے ہیں اور ایک ہی سانس میں خالی کردیتے ہیں، ملکہ خاموش ہے۔)

شہنشاہ: اور پھر ہماری زندگی میں ثریا داخل ہوئی۔ ثریا کے بے مثال حسن کے متعلق آپ نے بھی یقیناً سنا ہوگا۔ اور یہ سچ ہے کہ ہم ثریا کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور وہ نازک اندام بھی ہمارے لئے اپنے دل میں بے پناہ محبت رکھتی تھی۔ لیکن قدرت ابھی ہمارا امتحان لے رہی تھی۔ ملک ولی عہد سے محروم تھا۔ وہ دن ہم کبھی نہیں بھلا سکتے جب

ثریا نے ہم سے کہا تھا—

ثریا: (درد میں ڈوبی ہوئی آواز) کبھی کبھی انسان عجیب حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ جس شئے کو حاصل کرنے کی وہ خواہش کرتا ہے وہ اُس سے دور بھاگتی ہے۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ ثریا ایران کے ولی عہد کی ماں بنے

،لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ ہم نے اپنی زندگی کے عزیز ترین سات سال آپ کے ہمراہ گزارے اور اب ہمارے بچھڑنے کا وقت بھی آ گیا۔

(تھوڑا سا وقفہ)

شہنشاہ: بالآخر ثریا بھی ہم سے بچھڑ گئی۔ ہمیں ایسا لگا جیسے ہم زندگی بھر کبھی سچی محبت نہ پا سکیں گے۔ ولی عہد کی آرزو میں ہماری محبتیں قربان ہوتی رہیں گی۔ ہم بتا نہیں سکتے، اس وقت ہمیں کتنا رنج ہوا تھا جب حالات سے مجبور ہو کر ہم نے ثریا کو طلاق دی تھی۔ اُس وقت ثریا پر کیا گزری ہوگی۔

(شہنشاہ پھر شراب انڈیلتے ہیں اور پی جاتے ہیں۔)

شہنشاہ: شاید قدرت کا امتحان ختم ہو چکا تھا اور آپ ہمارے ویران محل میں خوشیوں کے شادیانے لے کر آئیں۔ ہمیں وہ ساعت سعید نصیب ہوئی جب ہم نے ولی عہد کی ولادت کی خبر سنی — یقیناً آپ نے ہمارے سارے غموں کو دور کر دیا تھا— لیکن تقدیر میں کچھ اور بھی

لکھا تھا، آج وہ سامنے آیا۔ ہمارے ساتھ آپ کو بھی مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے — آپ کہیں چلی جایئے ہمارے بچوں کو لے کر، تا کہ اس آگ کی آنچ اُن پر نہ پڑے۔ آپ ہمیں چھوڑ دیجیے۔

ملکہ: نہیں! ہم کبھی ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم خود غرض نہیں۔ ہمیں اپنی زندگی سے زیادہ عزیز آپ کی زندگی ہے۔

شہنشاہ: پتہ نہیں ملکہ ہمیں کون سے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ شاید یہ فوزیہ اور ثریا کی خاموش آہوں کا اثر ہے۔

(جب ہی دروازے پر ایک سپاہی آتا ہے۔)

سپاہی: یور ہائی نیس! ملکہ ثریا باریابی کی اجازت چاہتی ہیں۔

شہنشاہ: (حیرت سے) ثریا؟

(شہنشاہ کھڑے ہو جاتے ہیں، ملکہ بھی کھڑی ہو جاتی ہیں۔)

انھیں آنے دو۔

(سپاہی چلا جاتا ہے اور ثریا داخل ہوتی ہیں۔ تھوڑی دیر تک تینوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے رہتے ہیں۔)

شہنشاہ: (تھوڑا ہکلاتے ہوئے) آپ — آیئے۔

(ثریا آگے بڑھتی ہے۔)

ثریا:　آپ کو میری آمد سے حیرت ہونا ہی چاہئے　عرصہ ہوا ہمارا سماجی تعلق ٹوٹے ہوئے لیکن روحانی تعلق قائم ہے۔

شہنشاہ:　ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔

ثریا:　زہے نصیب۔

شہنشاہ:　تم نے اچھا کیا ثریا جو یہاں چلی آئیں۔ آج کل موت ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ پتہ نہیں کس وقت شمع زندگی گل ہو جائے۔ ہم نے جس ولی عہد کی خاطر تم سے علیحدگی اختیار کی تھی، وہ اب تخت شاہی سے محروم کر دیا گیا۔

ثریا:　خدا کرے کہ وہ خود ایک بار پھر تخت کو حاصل کریں۔

شہنشاہ:　بہت مشکل ہے ثریا — ثریا آج ہم تم سے معافی مانگنا چاہتے ہیں۔

ثریا:　کیسی معافی؟ آپ نے جو کچھ کیا تھا ٹھیک کیا تھا۔ آپ نے دانستہ طور پر تو ایسا نہیں کیا بلکہ حالات نے آپ کو مجبور کیا۔ اُس وقت آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا وہ بھی یہی کرتا　ہاں میری یہ بدقسمتی رہی کہ میں آپ کے کسی کام نہ آسکی۔

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ تینوں اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں۔ اچانک کھڑکی کے ایک گوشے سے پستول کی نالی نمایاں ہوتی ہے۔ ثریا کی نگاہ اس پر پڑ جاتی ہے۔ ثریا تیزی سے شاہ کی طرف بڑھتی ہے۔)

ثریا:　نہیں! (چیخ)

(گولی چلتی ہے اور شاہ کے بجائے ثریا کے لگتی ہے۔)

ثریا: آہ!

(قاتل بھاگ جاتا ہے۔ ثریا شاہ کی باہوں میں جھول جاتی ہے۔ شاہ اسے سنبھالتے ہوئے بیٹھ جاتے ہیں۔)

شہنشاہ: یہ تم نے کیا کیا ثریا — ہمیں کیوں بچالیا۔

ثریا: (لڑکھڑاتی ہوئی آواز) میرے سرتاج! — آج میری یہ آخری خواہش پوری ہوگئی۔ میری خواہش تھی میرا دم آپ کے باہوں میں نکلے اور آج — آج — یہ............۔

(ثریا کی گردن ایک طرف کو ڈھلک جاتی ہے)

شہنشاہ: ثریا! تم نے ہمیں پھر شرمندہ کردیا — نہیں! اب ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔

(شاہ اپنی جیب سے پستول نکالتے ہیں اور اپنے سر کا نشانہ بناتے ہیں، ملکہ پستول چھیننے کے لئے دوڑتی ہے۔)

ملکہ: نہیں! خدا کے واسطے ایسا نہ کیجئے۔

(لیکن گولی چلتی ہے — شاہ کے کراہنے کی آواز آتی ہے — ملکہ انھیں اپنی گود میں لے لیتی ہے۔)

شہنشاہ: (لرزتی ہوئی آواز) — بیگم! ہماری وجہ سے تم لوگوں کی زندگی بھی

دشوار ہوگئی تھی ہمارے بعد اب تم سے کوئی کچھ نہیں کہے گا
— ملکہ! ہم تمھیں ایک کہانی سناتے ہیں — بہت پہلے کی بات ہے
— ایک ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا — بہت شان و
شوکت والا تھا — جب بھی کسی نے اُس کے خلاف کوئی آواز اٹھائی
اُس نے اُسے ختم کرادیا لوگ اُسے ظالم کہنے لگے پھر
ایک دن تمام رعایا اس کے خلاف — بھڑک اٹھی — مجبوراً بادشاہ
کو ملک سے بھاگنا پڑا — وہ ادھر اُدھر پناہ ڈھونڈتا پھر

ا — جانتی ہو پھر اُس نے کیا کیا — اُس نے — اُس نے دریا میں کود کر اپنی جان
دے دی — اُس نے خودکشی کرلی — خودکشی..........

(شہنشاہ کو ہچکی آتی ہے اور وہ مرجاتے ہیں۔ ملکہ چیخ چیخ کر رونے لگتی ہے۔)

پردہ گرجاتا ہے

پہلے آپ

کردار:

کلیم : ماسٹر

امینہ : کلیم کی بیوی

سلیم : کلیم کا دوست

پہلا منظر

(کلیم اور امینہ کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ سلیم داخل ہوتا ہے۔)

سلیم: السلام علیکم۔

کلیم: وعلیکم السلام　ارے آؤ یار　کہاں ہو آج کل؟　تم تو نظر ہی نہیں آتے — بہت دن میں دکھائی دیے۔

سلیم: ہیں تو یہیں — لیکن یار تمہارے یہاں آنے کو دل نہیں چاہتا۔

امینہ: کیوں بھائی صاحب؟

سلیم: تم لوگوں کا جینا بھی کوئی جینا ہے　کہیں زندگی کی کوئی جھلک ہی نظر نہیں آتی — جب دیکھو خاموشی سے بیٹھے باتیں کرتے رہتے ہو۔

کلیم: زندگی کی جھلک کس طرح نظر آتی ہے؟

سلیم: تم لوگوں کی شادی کو اتنے برس ہوگئے، نہ کوئی جھگڑا، نہ لڑائی، یہ بھی کوئی

زندگی ہے، زندگی تو وہ ہے جب صبح شام لڑائی ہو، محلے والے سنیں، انھیں معلوم ہو کہ یہاں میاں بیوی رہتے ہیں، فرشتے نہیں۔

(سیم کی یہ بات سن کر کلیم اور امینہ ہنسنے لگے ہیں)

کلیم: دیکھو بھئی! جھگڑا تو ہمارے بیچ کبھی ہوگا نہیں۔

امینہ: ہاں بھائی صاحب۔ ہمیں ایک دوسرے سے کوئی شکایت ہی نہیں۔

سلیم: رہنے دو بھابھی — اتنا بڑا بول مت بولیے۔

کلیم: یہ بڑا بول نہیں — سچائی ہے۔

سلیم: اچھا شرط رہی۔

(سیم خدا حافظ کر کے وہاں سے چلا جاتا ہے۔ کلیم اور امینہ پھر باتیں کرنے لگتے ہیں۔)

کلیم: امینہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟

امینہ: محبت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

کلیم: کبھی سوچتا ہوں کہ خدا نہ کرے تم کبھی مجھ سے بچھڑ گئیں تو تمہارے بغیر کس طرح میں زندہ رہوں گا، اس لیے ہمیشہ خدا سے یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ دن دکھانے سے پہلے مجھے موت دے دے۔

امینہ: خدا نہ کرے کہ میں کبھی آپ کے بنا زندہ رہوں۔ میری زندگی تو صرف آپ ہی سے ہے — ایسی زندگی سے تو موت بہتر، جس میں آپ نہ ہوں۔

دوسرا منظر

(رات کا وقت۔ کلیم اور امینہ سونے کی تیاری
کررہے ہیں۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔)

کلیم: اس وقت کون ہوسکتا ہے؟

امینہ: پتہ نہیں — دیکھیے تو سہی —

(کلیم نے آہستہ سے دروازہ کھولتا ہے۔ دروازہ
کھلتے ہی ایک سفید داڑھی والے بزرگ اندر گھسے
چلے آتے ہیں۔ کلیم پریشان ہوتا ہے۔)

کلیم: ارے آپ کون ہیں؟ اور کیوں اندر آرہے ہیں؟

بزرگ: ہمیں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔

کلیم: لیکن آپ ہیں کون؟

بزرگ: ملک الموت — یعنی موت کا فرشتہ۔

کلیم: ملک الموت؟ لیکن یہاں کیوں آئے ہیں — کیا کام ہے؟

فرشتہ: میں تم دونوں میں سے ایک کو لے جانے آیا ہوں۔

کلیم: ہم دونوں میں سے — کیا مطلب؟ — کہاں اور کیوں؟

امینہ ہاں ہاں — صاف صاف بتایئے — کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ آج کل ہم کہیں نہیں جائیں گے — ان کی چھٹیاں بھی ختم ہوگئی ہیں۔

فرشتہ: وہاں تو ہمیشہ کے لیے جانا ہوگا — مجھے حکم ہوا ہے کہ تم دونوں میں سے ایک کی زندگی کا دروازہ بند کردوں۔تم میں سے کون میرے ساتھ چلے گا۔

(کلیم اور امینہ دونوں ایک دوسرے کے پاس آجاتے ہیں۔)

کلیم: نہیں!نہیں! ہم میں سے کوئی نہیں چلے گا۔

امینہ: ہاں بابا — ابھی تو ہماری عمریں بہت کم ہیں۔آپ کسی اور کے گھر چلے جایئے۔

فرشتہ: نہیں! مجھے تمہارے گھر بھیجا گیا ہے۔

کلیم: بزرگوار! آپ خود سوچئے کیا ابھی ہماری عمر مرنے کی ہے۔

فرشتہ: میں کچھ نہیں کرسکتا — جلدی فیصلہ کرو کہ کون میرے ساتھ چلے گا۔

کلیم: میں تو ابھی جاؤں گا نہیں—

امینہ: میں بھی نہیں جاؤں گی۔

کلیم: مجھے تو اسکول میں بہت کام ہیں— بچوں کے امتحان ہونے والے ہیں — میری ترقی ہونے والی ہے— اگلے مہینے میرا ہیڈ ماسٹر بننے کا چانس ہے۔ایسا کرو اسے لے جاؤ، اسے کوئی کام نہیں ہے۔

امینہ: واہ جی — مجھے کیوں کام نہیں ہوتا— میں کیسے جاسکتی ہوں، میرے بھائی کی شادی ہے۔ مجھے سنار سے اپنا ہار اور چوڑیاں لینے ہیں— میں تو اسے روپے بھی دے چکی ہوں۔

کلیم: روپے؟— روپے کہاں سے آئے تمہارے پاس — کہاں سے آئے اتنے روپے—؟

امینہ: کہیں سے آئے آپ سے مطلب؟ آپ کون پوچھنے والے۔

کلیم: میں کون؟ دیکھئے جناب ایسی عورت کو دنیا میں نہیں رہنا چاہیے— شوہر سے چھپاتی ہے　لے جایئے　اسے فوراً لے جایئے۔

امینہ: ہاں ہاں تمھیں رہنا چاہیے اس دنیا میں— بیس سال ہوگئے ماسٹری کرتے ہوئے— ذرا سی بھی ترقی نہیں— کیا فائدہ ایسی زندگی سے— تم نے اس نوکری میں مجھے دیا ہی کیا ہے؟

فرشتہ: ارے ارے تم لوگ تو لڑائی کرنے لگے— اس طرح تو مجھے بہت دیر

ہو جائے گی۔ جلدی فیصلہ کرو　اچھا میں تم دونوں کے نام کی
پرچی ڈالتا

ہوں — جس کا نام آئے گا اُسے لے جاؤں گا۔

دونوں ایک ساتھ کہتے ہیں کہ "ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے۔" جب فرشتہ کاغذ
نکالتا ہے تو دونوں پھر اسے روکتے ہیں، ٹھہر جایئے　جناب ٹھہر
جایئے —

فرشتہ　اب کیا بات ہے؟

کلیم:　اتنی کیا جلدی ہے جناب — ذرا سوچنے کا موقع دیجئے۔

فرشتہ:　بہت وقت دے چکا — اچھا پانچ منٹ کی اور مہلت دیتا ہوں —
دونوں فیصلہ کرلو۔

کلیم:　ٹھیک ہے — ٹھیک ہے — یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے جناب۔ آپ
ایسا کیجئے برابر والے کمرے میں ہمارے فیصلے کا انتظار کیجئے۔

فرشتہ　ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں، لیکن پانچ منٹ سے زیدہ ایک سکنڈ
بھی نہیں۔

(موت کا فرشتہ برابر والے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ کلیم اور امینہ باتیں
کرنے لگتے ہیں۔)

امینہ:　کیوں جی آپ تو کہتے تھے کہ کبھی تمہارے لیے جان کی بھی قربانی دیتی

پڑی تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ اب کیا بات ہے؟

کلیم　　ہاں ہاں وہ تو ٹھیک ہے — لیکن تم سمجھتی کیوں نہیں۔ اگلے مہینے میری ترقی ہونے والی ہے۔ بیس سال ماسٹری کرتے ہوئے ہو گئے اور اگر اسی طرح چلا گیا تو لوگ کیا کہیں گے کہ عمر بھر ماسٹر ہی رہا۔ ہیڈ ماسٹر بھی نہ بن سکا۔

امینہ:　　دیکھو جی میرے بھائی کی شادی ہے اور پہلا موقع ہے کہ میں سونے کا ہار اور چوڑیاں پہنوں گی — وہ بھی آپ نہیں چاہتے — آپ نے تو بھی بنوا کے

دیے نہیں — میں تو نہیں جانے کی —

کلیم:　　ہر بات میں ضد ٹھیک نہیں ہوتی — یقین کرو میں تمہاری چوڑیاں اور ہار تمہاری قبر میں رکھ دوں گا — اور ہیڈ ماسٹر ہونے کے بعد شاہ جہاں کی طرح تمہاری قبر پر مقبرہ بھی بنوادوں گا۔

امینہ:　　(غصہ میں) قبر میں جاؤ تم اور بھاڑ میں جائے تمہاری ہیڈ ماسٹری مجھے نہیں بنوانا مقبرہ — اپنی قبر پر تاج محل بنوالینا — میں نے کہہ دیا، میں نہیں جاؤں گی۔

کلیم　　دیکھو مجھے غصہ نہ دلاؤ — میں کہتا ہوں تم چلی جاؤ۔ ہیڈ ماسٹر ہونے کے بعد میں بھی آجاؤں گا —

امینہ: میں نے کہہ دیا میں نہیں جاؤں گی بس —

کلیم: دیکھو پانچ منٹ ہونے والے ہیں، اب بھی مان لو ورنہ ...

امینہ: ورنہ کیا کرو گے؟

کلیم: میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔

امینہ: دبا کر تو دیکھو — بڑے دیکھے ہیں دبانے والے —

(کلیم امینہ کا گلا دبانے لگتا ہے اور وہ چیختی ہے۔)

امینہ: ارے ارے — چھوڑو میرا گلا — چھوڑو۔

(اسی وقت سلیم اندر آتا ہے۔ دونوں کو جھگڑتے دیکھ کر کہتا ہے)

سلیم: ارے ارے — یہ کیا کر رہے ہو؟ — پاگل ہو گئے ہو کیا؟ — چھوڑو بھابھی کو۔ کیا بات ہے بھابھی؟ — آج میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں — آپ لوگوں میں تو کبھی جھگڑا نہیں ہوا اور ہوا تو اتنا زبردست — آخر کیا بات ہے؟

کلیم: برابر والے کمرے میں جا کر دیکھ لو —

سلیم: کیوں کیا ہے وہاں — میں تو اُدھر ہی سے آ رہا ہوں۔

کلیم: وہاں کوئی نہیں؟

سلیم: نہیں تو۔

کلیم: وہ موت کا فرشتہ۔

سلیم: موت کا فرشتہ۔

امینہ: ہاں، ابھی ابھی یہاں آیا تھا۔

سلیم: ارے وہ تو آپ لوگوں کی لڑائی دیکھ کر بھاگ گیا ہوگا۔ اچھا بھابھی جی آپ شرط ہار گئیں — پارٹی وغیرہ ہو جائے۔

امینہ: کیسی شرط؟

سلیم: وہی کہ ہم دونوں میں کبھی لڑائی نہیں ہو سکتی — یہ لیجیے آپ کی لڑائی کی ریکارڈنگ موجود ہے، ثبوت کے لیے۔

کلیم: اچھا تو یہ آپ کی شرارت تھی۔

سلیم: ارے نہیں — نہیں — وہ تو موت کا فرشتہ تھا۔

(کلیم سلیم کو مارنے کے لیے بھاگتا ہے۔)

سلیم: ارے ارے اب کیا میرا گلا دباؤ گے —

امینہ: اور میرا گلا دبا دیا ہوتا تب —

سلیم: ارے نہیں بھابھی — اس نے اتنی طاقت سے تھوڑے ہی دبایا ہوگا — اچھا یہ بتایئے — ہار اور چوڑیاں کب آ رہے ہیں؟

امینہ: (ہکلاتے ہوئے) ارے — ارے — وہ تو میں ویسے ہی کہہ رہی تھی۔

سلیم: دیکھیے بھابھی — چھپایئے نہیں — بلاؤں موت کے فرشتے کو۔ ارے بھئی پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔

(سلیم دوسری طرف منہ کر کے فرشتہ کی آواز نکالتا ہے)

''بولو تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا؟ — کون میرے ساتھ چلے گا؟''

کلیم: فرشتے کے بچے — ادھر آ — پہلے میں تجھے ہی بھیجتا ہوں۔

(اس بات پر سب زور زور سے ہنسنے لگتے ہیں۔)

——————

Bazm-e-Daagh

(DRAME)

Ibne Kanwal

R-373/3, Jogabai Ext., Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025
Mob: 9811794822 / 21, E-mail: markazipublication@gmail.com